انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو

مدیر مسئول: سید راشد حامدی —— مدیر: ابوالاعلیٰ سید سبحانی

جلد: ۲، شمارہ: ۵، ستمبر ۲۰۱۷ء / ذی الحجہ۔محرم الحرام ۱۴۳۸ھ

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی .... نئی دہلی

زبیر ملک فلاحی .... لکھنؤ

انیس احمد فلاحی .... جامعۃ الفلاح

فی شمارہ:	اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون:	اندرون ملک	۳۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Ali,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Printed at**: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Abul Aala Sayyed**

نقوشِ حیات

اداریہ	ابوالاعلیٰ سید سبحانی	۳
اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۲۶)	ڈاکٹر محی الدین غازی	۵
افاداتِ جلیل احسن ندویؒ (۴)	ظفر احمد الاثری	۱۱
طلاق، رحمت یا زحمت	خبیب کاظمی	۴۳
محمد مارماڈیوک پکتھال کے تہذیبی افکار	ضمیر الحسن خاں فلاحی	۴۹
تحریک اسلامی ہند کا نیر اعظم	ابوسعد فلاحی	۵۴
رضاکار	ضیاء الرحمٰن محمد شفیع فلاحی	۶۱
بچے کی تربیت میں ماں کا رول	خنساء سبحانی	۶۵
افسانہ ''مسنگ مین'' کا تجزیہ	ڈاکٹر ابوارشد فلاحی	۷۱
مشاہیر کے خطوط	ادارہ	۷۶
شعر و نغمہ	شرکائے بزم	۸۰
تعارف و تبصرہ	سعید اختر اعظمی	۸۵
آپ کے خطوط	قارئین	۸۸
جامعہ کے لیل ونہار و اخبار انجمن	مصباح الباری فلاحی	۹۱

خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ

Zeeshan Apartment, F-9, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

Email: jareedahayatenau@gmail.com

موبائل نمبر (مدیر مسئول): +91-9811126467

موبائل نمبر (مدیر): +91-9891051676

اپنی بات

گزشتہ دنوں لکھنؤ سفر کے دوران اتفاقی طور پر ایک نومسلم سے ملاقات ہوگئی۔ تعارف اور بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ ان کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اُن کے بیوی بچے بھی مشرف بہ اسلام ہوگئے ہیں۔ بات چیت اور آگے بڑھی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کو لے کر کافی پریشان چل رہے ہیں، اور خاندان والوں کی جانب سے ان پر اور ان کی فیملی پر مستقل دباؤ بنایا جارہا ہے کہ وہ واپس اپنے مذہب کی طرف لوٹ آئیں۔ مزید تفصیلات میں جانے پر معلوم ہوا کہ وہ اپنے بچوں اور بچیوں کی دینی تعلیم کے لیے متعدد سنجیدہ قسم کی کوششیں بھی کرچکے ہیں، لیکن بوجوہ ناکام رہے۔

بچوں کی دینی تعلیم کا مسئلہ جب زیر گفتگو آیا، تو اس سلسلے میں ان کی کوششوں کو بھی جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ تفصیلات جان کر حیرت کم ہوئی، افسوس زیادہ ہوا۔ حیرت کم ہوئی اس لیے کہ جو باتیں ان سے سننے کو ملیں وہ سب واقعہ کے طور پر ہماری نگاہوں کے سامنے موجود ہیں۔ افسوس زیادہ ہوا اس لیے کہ جو کام ملت اسلامیہ ہند اور اس کے نمائندہ اداروں کو بہت پہلے کرلینا تھا، وہ آج بھی نہیں ہوسکا ہے اور آئندہ بھی اس کے ہونے کے امکانات کم ہی نظر آتے۔

نومسلمین کی دینی تعلیم وتربیت اس وقت دعوت دین کا کام کرنے والوں کے لیے بھی ایک بڑا چیلنج ہے اور ان نومسلمین کے لیے بھی ایک بڑا چیلنج ہے جو دل کی آواز پر یا کچھ ذاتی مطالعہ اور مشاہدہ کی بنا پر قبول اسلام کا فیصلہ کرلیتے ہیں۔ نومسلمین کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے اس وقت کم از کم شمالی ہند کی حد تک کوئی ایک بھی قابل ذکر ادارہ ایسا نہیں ملتا ہے جس پر اس سلسلے میں اعتماد کیا جاسکے۔

مدارس اسلامیہ ہند اپنا مخصوص مزاج اور مخصوص نظام ونصاب رکھتے ہیں، اور ایک نومسلم کے لیے اس نظام اور نصاب کا حصہ بننا، اور وہاں کے ماحول میں گھل مل کر اپنی شخصیت میں موجود معاشرتی خلا کو بھر پانا، اپنے آپ میں ایک مشکل بلکہ بسا اوقات ناممکن کام ہوتا ہے۔ خاص طور پر زبان اور مزاج کا مسئلہ اس ضمن میں ایک بڑی رکاوٹ ہوتا ہے۔

مدارس اسلامیہ آج بھی علاقائی زبانوں کو اپنے نصاب کا حصہ بنانے کے سلسلے میں سنجیدہ نہیں ہیں، چنانچہ مدارس سے استفادے کے لیے اردو زبان سے واقفیت لازمی قرار پاتی ہے، اس لیے کہ وہاں تعلیم کا

میڈیم بھی اردو ہوتا ہے اور طلبہ واساتذہ کی بول چال کی زبان بھی اردو ہوتی ہے، ایسی صورت میں ایک نومسلم کے لیے کسی مدرسے سے صحیح معنوں میں استفادہ کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اردو زبان سے اچھی واقفیت حاصل کرے۔ مشاہدہ کی بات یہ ہے کہ سالہاسال کا وقت اردو زبان سیکھنے میں لگا دینے کے باوجود بھی وہ اردو زبان کے سلسلے میں اس حد تک اعتماد نہیں حاصل کر پاتے کہ دینی علوم پر مطلوبہ حد تک توجہ دیں یا شرعی علوم کے سلسلے میں اعتماد کی قوت حاصل کرسکیں۔

مزاج کا مسئلہ بھی ایک بڑا مسئلہ ہے، مدارس اسلامیہ ہند کا مزاج 'مخصوص ملی رنگ' رکھتا ہے، اور اس مزاج کی تشکیل میں جہاں ملی طرز فکر اور ملی طرز معاشرت کا حصہ ہے وہیں ایک بڑا حصہ مخصوص مکاتب فکر اور مسالک سے ان کی وابستگی کا ہے۔ یہ مزاج نومسلمین کے لیے اپنے آپ میں ایک بڑا چیلنج ہوتا ہے، قبول اسلام کے وقت ان کے سامنے ایک بڑا چیلنج مختلف مذاہب کے درمیان ایک سچے مذہب کی تشخیص ہوتی ہے، جو اپنی تمام مشکلوں کے باوجود مختلف مسالک کے درمیان درست مسلک کی تشخیص کے بالمقابل قدرے آسان ہوتی ہے، لیکن یہ مرحلہ اس کے لیے سخت ترین ہوتا ہے اور بسا اوقات سچائی تک پہنچ کر اس سے پھر جانے کا راستہ فراہم کرنے والا ہوتا ہے۔

مزاج ہی کا ایک پہلو رویے اور کردار سے متعلق ہے۔ مدارس اسلامیہ بالخصوص اور ملت اسلامیہ بالعموم داعیانہ کردار اور دعوتی رویوں سے محروم ہے، اور اس محرومی میں بڑا کردار نصب العین سے اجتماعی غفلت کا ہے۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ نو واردین کے ساتھ اس کے طلبہ ساتھیوں اور اساتذہ کا جو رویہ ہونا چاہیے وہ رویہ نہیں ہوتا۔ ان کو جو شفقت اور دلجوئی مطلوب ہوتی ہے وہ ان کو نہیں مل پاتی ہے۔ ان کے سیدھے سادھے، ٹیڑھے میڑھے اور بسا اوقات بھولے بھالے سوالات کا ان کو وہ جواب نہیں مل پاتا جو انہیں ملنا چاہیے۔ یہ مرحلہ بسا اوقات بہت کٹھن صورت اختیار کرجاتا ہے۔

مدارس اسلامیہ کے تعلق سے یا بحیثیت مجموعی ملت اسلامیہ ہند کے تعلق سے جس صورتحال کا تذکرہ کیا گیا، اس صورتحال کا مشاہدہ بہت آسانی کے ساتھ اور بہت قریب سے کیا جاسکتا ہے۔

اس صورتحال کی تبدیلی وقت کی بڑی ضرورت بنتی جارہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ملت اسلامیہ ہند کے درمیان نصب العین سے اجتماعی وابستگی پیدا کی جائے۔ مخاطب کی زبانوں یا سماج کی زبانوں کو مطلوبہ اہمیت دی جائے اور ان کو مدارس کے نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ اسلام کو برادران وطن کے درمیان مثبت توجہ کا مرکز بنایا جائے۔ یقیناً ملت کی صورتحال کی تبدیلی اور نصب العین سے اس کی وابستگی لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(ابوالاعلی سید سبحانی)

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۲۶)

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی، ای میل:mohiuddin.ghazi@gmail.com

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر ہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ اس جائزہ میں نہ کسی طرح کا احترام مانع ہونا چاہئے اور نہ کوئی نسبت حائل ہونی چاہئے، راقم کی رائے میں ہونا تو یہ چاہئے کہ ترجمہ قرآن کا کام اجتماعی طور پر اکیڈمی کی سطح پر اور متعدد بار متعدد ماہرین لغت کی نظر سے گذرنے کے بعد قابل اشاعت سمجھا جائے، اور اشاعت کے بعد بھی نظر ثانی کا کام جاری رہے۔ لیکن بوجوہ تراجم قرآن کے ساتھ ایسا اہتمام نہیں ہوسکا۔ عام طور سے ہر ترجمہ قرآن ایک انفرادی کوشش رہی ہے، اور اس لئے غلطیوں کا امکان کسی نہ کسی حد تک ہر ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔

----

(۱۱۶) یولج کا ترجمہ

ایلاج کے معنی داخل کرنا ہوتا ہے، قرآن مجید میں رات اور دن کے حوالے سے یہ فعل پانچ آیتوں میں ذکر ہوا ہے۔ ان آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔

ان پانچ آیتوں میں سے ایک آیت کا ترجمہ صاحب تفہیم القرآن نے داخل کرنے کے بجائے نکالنا کیا ہے، یہ ترجمہ درست نہیں ہے۔

پہلی بات کہ یہ ترجمہ آیت کے الفاظ کے خلاف ہے، ایلاج کے معنی داخل کرنا ہے نکالنا نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس مفہوم کی تائید میں کوئی اور نظیر بھی نہیں ہے، قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں آیا ہے کہ اللہ دن سے رات کو اور رات سے دن کو نکالتا ہے۔ صرف ایک مقام پر آیا ہے: وَآيَةٌ لَّهُمُ اللَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَإِذَا هُم مُّظْلِمُونَ۔ (یس:۳۷) یہاں اندر سے نکالنے کی بات نہیں بلکہ سلخ یعنی رات کے اوپر سے دن کو کھینچ لینے کی بات ہے۔

تیسری ایک بات یہ بھی ہے کہ خود صاحب تفہیم نے باقی چار آیتوں کا ترجمہ دیگر مترجمین کی طرح داخل کرنا کیا ہے، جیسا کہ ذیل میں دیکھا جاسکتا ہے، اس لیے بلاتردد کہا جاسکتا ہے کہ پانچ میں سے اس ایک مقام پر ان سے ترجمہ کرتے ہوئے سہو ہوگیا ہے۔

(۱) ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَأَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ۔ (الحج:۶۱)

"یہ اس لیے کہ رات سے دن اور دن سے رات نکالنے والا اللہ ہی ہے" (سید مودودی)

"یہ سبب اس کے ہے کہ اللہ داخل کرتا ہے رات کو بیچ دن کے اور داخل کرتا ہے دن کو بیچ رات کے" (شاہ رفیع الدین)

"یہ اس لیے کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے" (محمد جوناگڑھی)

"یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ رات کو ڈالتا ہے دن کے حصہ میں اور دن کو لاتا ہے رات کے حصہ میں" (احمد رضا خان)

"یہ اس لیے کہ خدا رات کو دن میں داخل کردیتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے" (فتح محمد

جالندھری)

(۲) تُولِجُ اللَّيْلَ فِیُ النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِیُ اللَّيْلِ۔ (آل عمران:۲۷)

رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں (سید مودودی)

(۳) أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِیُ النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِیُ اللَّيْلِ۔ (لقمان:۲۹)

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں؟'' (سید مودودی)

(۴) يُولِجُ اللَّيْلَ فِیُ النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِیُ اللَّيْلِ ۔ (فاطر:۱۳)

''وہ دن کے اندر رات کو اور رات کے اندر دن کو پروتا ہوا لے آتا ہے'' (سید مودودی)

(۵) يُولِجُ اللَّيْلَ فِیُ النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِیُ اللَّيْلِ۔ (الحدید:٦)

''وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے'' (سید مودودی)

(۱۱۷) باء برائے تجرید

جس طرح حرف من تجرید کے لیے آتا ہے اسی طرح حرف باء بھی تجرید کے لیے آتا ہے، امام لغت ابن جنی اس کی مثال دی ہے، لقیت به الاسد، وجاورت به البحر. الخصائص (۴۷۷/۲)

قرآن مجید کے بعض مقامات پر اگر تجرید کا اسلوب سامنے رہے تو مفہوم بہت واضح ہو کر سامنے آتا ہے، اور اس میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا۔ ذیل میں دو آیتوں پر گفتگو کی جائے جہاں باء کو برائے تجرید ماننا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهِ سَامِراً تَهْجُرُونَ۔ (المومنون:٦٧)

اس آیت کا ترجمہ عام طور سے اس طرح کیا گیا ہے کہ مستکبرین اور تھجرون کا جو فاعل ہے وہی سامرا کا فاعل بھی ہے یعنی رسول کی باتوں کا انکار کرنے والے۔ ذیل کے ترجمے ملاحظہ ہوں:

''اپنے گھمنڈ میں اُس کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے اپنی چوپالوں میں اُس پر باتیں چھانٹتے اور بکواس کیا کرتے تھے'' (سید مودودی)

''خدمت حرم پر بڑائی مارتے ہو رات کو وہاں بیہودہ کہانیاں بکتے'' (احمد رضا خان)

''ان سے سرکشی کرتے، کہانیوں میں مشغول ہوتے اور بیہودہ بکواس کرتے تھے'' (فتح محمد جالندھری)

''اکڑتے اینٹھتے افسانہ گوئی کرتے اسے چھوڑ دیتے تھے'' (محمد جوناگڑھی)

اس مفہوم کومراد لینے پرایک اشکال یہ سامنے آتا ہے کہ سامرواحد ہے، تو اس سے مراد جمع کیوں لیا جائے؟

مزید یہ کہ جب مستکبرین اور تھجرون جمع استعمال ہوئے ہیں تو درمیان میں سامرا واحد کیوں استعمال کیا گیا؟

مفسرین اس اشکال کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان جوابوں میں تکلف پایا جاتا ہے۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ اگر سامر سے مراد منکرین رسول کو لیا جائے تو سامر کا مفہوم اس پورے سیاق میں کوئی خاص معنویت نہیں ادا کرتا۔ استکبار اور ھجر تو واضح طور پر مذموم رویے ہیں، اور منکرین سے ان کا تعلق بھی واضح ہے لیکن دونوں کے بیچ میں سمر یعنی قصہ گوئی کی مناسبت واضح نہیں ہو پاتی۔

اس کے علاوہ یہ مفہوم لینے کے بعد (بہ) میں ضمیر کا مرجع متعین کرنے میں بھی لوگوں کو دشواری پیش آتی ہے۔

اگر (بہ) میں باء کو تجرید کا مان لیں، اور ھاء ضمیر کو رسول کے لیے مان لیں جیسا کہ آگے کی آیتوں سے واضح ہوتا ہے، اور سامرا کو ھاء ضمیر سے حال مان لیں تو مفہوم بخوبی واضح ہوجاتا ہے اور تمام اشکالات دور ہوجاتے ہیں۔ اس توجیہ کے مطابق آیت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول کا انکار کرنے والے گھمنڈ میں مبتلا ہیں، وہ رسول کی بات سننے کے بجائے یہ کہہ کر اس سے دور ہٹ جاتے ہیں کہ یہ تو محض قصہ گو اور بکواس کررہا ہے۔

آیت کا ترجمہ اس طرح ہوگا:

''گھمنڈ میں اُس کو چھوڑ دیتے تھے، گویا وہ بکواس کر رہا ہے'' (امانت اللہ اصلاحی)

''گھمنڈ کرتے ہوئے گویا کسی افسانہ گو کو چھوڑ رہے ہو'' (امین احسن اصلاحی، یہ ترجمہ درست ہے، البتہ اس کی تفسیر میں بہ میں باء کو تجرید کا ماننے کے بجائے استہزاء کو محذوف مان کر باء کو اس سے متعلق مانا گیا ہے، ایک تو اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے، پھر لفظ تھجرون سے خود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ موقعہ مذاق اڑانے کا نہیں بلکہ اعراض کرنے کا ہے۔ مزید یہ کہ خود ترجمہ سے استہزاء کے مفہوم کا اظہار نہیں ہوتا ہے)

’’غرور میں آکر اسے کہانی سمجھ کر چلے جایا کرتے تھے‘‘(احمد علی، اس ترجمہ میں سامر کے لیے کہانی کا لفظ درست نہیں ہے، کہانی سنانے والے کے لیے سامر آتا ہے)

’’اس سے بڑائی کر کر ایک کہانی والے کو چھوڑ کر چلے گئے‘‘(شاہ عبدالقادر، سامر کا ترجمہ درست ہے، البتہ بہ کو مستکبرین سے متعلق مانا ہے جو محل نظر ہے)

علامہ فراہی مفسرین کی معروف توجیہ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ولا يخلو من تكلف۔ والأولى من كل ذلك أن يكون (سامرا) مفعول (تهجرون)۔ أی نكوصكم عن استماع آياتی مستكبرين كان على حالة كأنكم تتركون بفعلكم۔ هذا سامرا لا تعبأون بقوله۔ والآية التالية تبين ذلك۔ ويقرب من هذا التأويل أن يكون (به) متعلقا ب(سامرا)۔ وفی جعل الضمير مذكرا دلالة على أنهم لم يظنوا أنها آيات الله، وانما ظنوها قولا من السامر. فهذان تأويلان متقاربان – والله أعلم.(التعليقات)

مولانا امانت اللہ اصلاحی اس اہم گفتگو پر یہ قیمتی اضافہ کرتے ہیں کہ یہاں باء برائے تجرید ہے۔اور ھاء کا مرجع رسول ہے۔

(۲) الَّـذِیْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ أَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَی عَلَی الْعَرْشِ الرَّحْمَنُ فَاسْأَلْ بِهِ خَبِیْراً۔(الفرقان:۵۹)

’’وہ بڑی مہر والا ہے، سو پوچھ اس سے جو اس کی خبر رکھتا ہو‘‘ (شاہ عبدالقادر)

’’وہ رحمان ہے پس اس کی شان باخبر سے پوچھو‘‘(امین احسن اصلاحی)

’’رحمٰن، اس کی شان بس کسی جاننے والے سے پوچھو‘‘(سید مودودی)

’’وہ بڑی مہر والا تو کسی جاننے والے سے اس کی تعریف پوچھ‘‘(احمد رضا خان)

اس آیت کے ترجمے کی یہ چند مثالیں ہیں، عام طور سے لوگوں نے اسی طرح ترجمہ کیا ہے، جس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ اللہ کے بارے میں اس سے پوچھو جو اللہ سے باخبر ہو۔

اس مفہوم میں ایک اشکال یہ ہے کہ اللہ کے بارے میں خبیر ہونے کا دعوی کون کر سکتا ہے، اور کس کے بارے میں یہ دعوی کیا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ سے باخبر ہے۔

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر خبیر کا لفظ آیا ہے اور ہر جگہ اللہ کے لیے آیا ہے، کسی اور کے لیے یہ لفظ نہیں آیا ہے۔

مزید ایک بات یہ ہے کہ سأل بہ کے معنی ''اس کے بارے میں پوچھنا'' عام استعمالات کے مطابق نہیں ہے۔عام استعمال کے مطابق سأل کے ساتھ جب ب آتا ہے تو مطالبہ کرنے کے معنی میں ہوتا ہے، پوچھنے کے معنی میں نہیں ہوتا ہے۔اور جب عن آتا ہے تو پوچھنے کے معنی میں آتا ہے۔اور اگر کوئی صلہ نہیں ہو تو مانگنے کے معنی میں ہوتا ہے۔

اگر باء کو برائے تجرید مان لیں تو یہ سارے اشکالات دور ہو جاتے ہیں، اور ترجمہ اس طرح ہوتا ہے:

''تم مانگو، اسے باخبر پاؤ گے'' (امانت اللہ اصلاحی)

اس توجیہ کے مطابق خبیر اللہ کی صفت قرار پاتی ہے جس طرح قرآن مجید میں باقی تمام مقامات پر خبیر کی صفت اللہ کے لئے آئی ہے، اور فاسأل کا مفہوم یہاں اللہ سے مانگنا ہے، جو ہر چیز سے باخبر ہے۔ بہ میں باء تجرید کے لئے ہے اور ھاء کی ضمیر کا مرجع اللہ ہے۔

اس آیت کی توجیہ میں اہل نحو کو جو دشواریوں پیش آئی ہیں اس کا اندازہ ابن ھشام کی درج ذیل عبارت سے ہو سکتا ہے:

وَتَأَول البصريون (فاسأل بِهِ خَبِيرا) علىَ أن البَاء للسَّبَبِيَّة وَزَعَمُوا أَنَّهَا لَا تكون بِمَعنى عَـن أصـلا وَ فيـه بـعـد لِأَنـهُ لَا يَقتَضِى قَولك سأَلت بِسَبَبه أَن المَجرُور هُوَالمسؤول عَنهُ۔ (مغنی اللبیب، ص:۱۴۲)

کوفی نحاۃ کے نزدیک باء عن کے معنی میں ہے، جب کہ بصری نحاۃ اسے عن کے معنی میں لینا درست نہیں سمجھتے اور برائے سبب قرار دیتے ہیں، ابن ھشام ان کی رائے کو بھی غیر موزوں قرار دیتے ہیں، ایسی صورت میں ان بعض نحویوں کی بات زیادہ مضبوط لگتی ہے جو اسے تجرید کے لیے مانتے ہیں، الباقولی لکھتے ہیں: (فَسْئَلْ بِهِ خَبِيراً): أى اسأل الله خبيرا۔ (اعراب القرآن للباقولی)

افادات جلیل احسن ندویؒ (۴)

ظفر احمد الاثری، لندن، ای میل:asarizafar@hotmail.com

افادات متعلق سورہ یونس مکیہ (۱)

ھذہ السورۃ تبشر المومنین والغالبین منذرۃ الکافرین (یہ سورہ مومنین اور غلبہ حاصل کرنے والوں کو بشارت دے رہی ہے اور کافرین کو انذار کر رہی ہے)۔(۲)

جب حق و باطل میں کشمکش ہوتی ہے تو حق غالب اور باطل مغلوب ہوکر رہ جاتا ہے اور یہی اللہ کی سنت ہے۔ چونکہ اس دور میں حق و باطل کی کشمکش ہے، اس لیے اس میں ساتھ ہی ساتھ تسلی کا پہلو بھی ہے۔

یہ تیسرے گروپ کی پہلی سورہ ہے جو سورہ نور پر ختم ہوتی ہے مولانا جلیل احسن ندویؒ فرماتے ہیں کہ ''اس گروپ میں حق و باطل کی کشمکش اور سنت الٰہیہ کا بیان ہے''۔(۳)

(الر) ھذہ السورۃ ــ'' الر''(۴)

[الکتاب الحکیم] یہ وہ کتاب ہے جس کی پیشین گوئی اس سے پہلے کی جا چکی ہے۔

[الحکیم] جو سوچ سمجھ کر با مقصد کام کرتا ہے۔ چونکہ یہ کتاب اللہ حکیم کی طرف سے آئی ہے اس لیے یہ کتاب حکیم ہوگی۔ جو کچھ یہ کتاب فیصلہ کرتی ہے وہ بالکل حق ہے، اس میں کسی شبہہ کا امکان نہیں۔ اس کا خاتمہ بھی اتبع ما یوحی الیك۔

(العجب) ما یتعجب منہ۔ یہاں تعجب بمعنی انکار حق ہے کیونکہ الناس سے مراد مشرکین ہیں۔ استفہام اس لیے نہیں ہوسکتا کہ ان کے اس طرزعمل کو ناپسند کر رہا ہے کہ یہ مخالفت اور انکار کی روش اختیار کرنے کا کوئی موقع و محل نہیں ہے۔

[آیت ۱](۵)

[ان لھم قدم صدق عندربھم] (٦)

[ان هذا لساحر مبین]:(۷)

[ید بر الامر]:(۸)

[ما من شفیع الا من بعد اذنه]: (۹)

[فاعبدوه]:(۱۰)

[افلا تذکرون]: (۱۱)

[مرجعکم]:(۱۲)

[یبدؤالخلق ثم یعیده]:(۱۳)

[وعذاب الیم بما کانوا یکفرون]:(۱۴)

(آیت۵)[ضیاء]: جس کے اندر تابش ہو، چمک ہو، آنکھوں کو خیرہ کرتی ہو۔

[نور]: نور میں تابش نہیں ہوتی یہ آنکھوں کو خیرہ نہیں کرتی۔

[قدّره]: قَسّمَ بقدر [منازل]: چاند کا گھٹنا و بڑھنا۔

[ذالك]: کہنا یہ چاہتا ہے کہ جس طرح یہ چاند گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اسی طرح یہ موجودہ زندگی بھی ہے۔ تمہاری یہ زندگی بھی ختم ہو کر رہے گی۔ اس کے بعد آخرت آئے گی۔

[بالحق]: ایک غایت کے تحت۔

[الآیات]: ہر طرح کی نشانیاں۔ [قوم]:علماء لوگ۔

(آیت۶)[الآیات]: توحید و معاد کی آیتیں، اور لقائے رب کی آیتیں موجود ہیں۔ [یتقون]: آخرت کے سرمدی عذاب سے بچنے کے لیے اس دعوت پر ایمان لاتے ہیں۔

(آیت۷) اس کے مقابلے میں ایک دوسرا گروہ ہے جو ایمان نہیں لایا۔

[رضوا] کی تشریح ''واطمأنوا'' ہے، اس حیات دنیا کے بارے میں کوئی کانٹا نہیں چبھتا۔ یہ نصب العین ان کے دلوں میں بس گیا ہے۔

[آیات] معاد، آخرت کی جو دلیل ہے اس پر غور نہیں کرتے ہیں۔

(آیت۸) مأویٰ: مستقل قیام گاہ۔ [بما کانوا] حیات دنیا کو نصب العین بنا کر انہوں نے یہ کمائی کی ہے۔

(آیت۹)'' ان الذین آمنوا'' اوپر کی آیت کی بالکل ضد ہے۔ یعنی یہ لوگ لقائے رب کی امید

رکھتے ہیں۔

[ھدی] لے جانا۔

[الی (الجنۃ) بایمانھم]: ایمان کی روشنی ملی، اس کے بدولت آخرت میں وہ کامیاب ہوں گے۔ [تجری] حال ہے۔

(آیت۱۰) دعویٰ: ان کی پکار، ان کا کہنا یہ ہوگا۔

[سبحانك] تو اس سے پاک ہے کہ تو کسی چیز کا وعدہ کرے اور اس کو پورا نہ کرے۔ ہم سے جو وعدہ کیا گیا تھا اسے ہم نے صحیح صحیح پایا۔ اس وعدہ کے بدلے آج ہمیں جنت ملی۔ یہ شکر کے جذبہ میں کہیں گے اور آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دیں گے۔

[آخر] شکر ہے کہ اس نے ہم کو یہاں پہنچا دیا۔ سورہ اعراف میں اس کا ذکر موجود ہے۔

[نودوا] یہ وہ جنت ہے جس کا لفظوں میں ذکر کیا گیا تھا۔

(آیت۱۱)[الشر،] عذاب۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخرت کیوں نہیں آتی، تو اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

[استعجالھم] جس طرح خیر میں جلدی کرتا ہے، اگر اسی طرح وہ شر میں جلدی کرنے لگے تو ان پر عذاب الٰہی آجاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، اس بنا پر کہ وہ رحیم ہے۔ اور یہ جو وقت ان پر چل رہا ہے یہ مہلت کا وقت ہے۔ وہ اس وقت مہلت کے قانون میں ہیں۔ وہ چاہتا تو اس میں پکڑ سکتا تھا۔ اور موقع ایسا ہی ہے کہ انہیں پکڑ لیا جائے لیکن رب کے رحیم ہونے کی وجہ سے ان پر کوئی عذاب نازل نہیں کیا جا رہا ہے۔

[طغیان] قرآن کی زبان میں ''دنیا پرستی'' اور دنیا کو نصب العین بنانے کے آتے ہیں۔

[یعمھون] پھر وہ ہدایت نہیں پا سکتا ہے۔ آگے کی آیتوں میں ان کے طغیان اور سرکشی کا ذکر ہے۔

(آیت۱۲) اس آیت میں توحید کی فطری دلیل دی جا رہی ہے، اور طغیان کی تصویر کشی ہے۔ قرآن جس کی دعوت دے رہا ہے وہ انسان کے اندر موجود ہے۔

[مس] چمٹ جانا۔ [الضر] وہ مصیبت جس میں جان کے تلف ہو جانے کا خطرہ ہو۔

[لجنبہ، مضطجعاً، قاعداً أو قائماً] ہر حالت میں وہ اسے پکارتا ہے۔ اس وقت نہ کوئی دیوی دیوتا کی یاد آتی ہے اور نہ کسی اور کی۔ اگر کوئی یاد آتا ہے تو بس اللہ کی ذات۔

[لم یدعنا] اس مصیبت کو دور کرنے کے لیے پکارا تھا جس میں وہ پھنس جاتا ہے۔ یہ تمہاری فطرت میں موجود ہے کہ اللہ کا نام لو لیکن تم اس سے انکار کر رہے ہو۔

[کذالك] چونکہ اس نے دیا ہے، اس لیے اس کے سامنے شرک وطغیان اچھا لگنے لگتا ہے، اور اسی شرک کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ ایک طرف طغیان کی تصویر ہے، دوسری طرف یہ بتلایا جا رہا ہے کہ مصیبت کے وقت تمہارے اندر توحید ابھر کر آ جاتی ہے۔

(آیت ۱۳) عاد وثمود کو تباہ کیا، تمہیں خبر نہیں۔

[ظلموا] اللہ کے رسول کے ساتھ، اس کے احکام کے ساتھ انھوں نے ظلم کیا تو ہم نے ان کو تباہ کر دیا۔

[و] حالیہ ہے۔ حال یہ تھا کہ ان کے پاس رسول آئے، لیکن وہ رسول کو جھٹلاتے رہے۔ بالآخر وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے پس وہ تباہی کے حوالے کر دیے گئے۔

[مجرمین] رسالت کو جھٹلانے والو، اسی پاداش میں وہ ہلاک کر دیے گئے تم اس سے نصیحت نہیں حاصل کرتے۔

[خلائف] وہ بااقتدار قومیں تھیں، ان کو ہلاک کر دیا۔ ہم نے تم کو ان کا جانشین مقرر کیا۔ یعنی تم اس وقت پورے عرب میں چھائے ہوئے ہو، تمہارا اقتدار کا سکہ پورے عرب میں ہے۔ ہم نے ایسا صرف اس لیے کیا ہے کہ دیکھیں کون کیسا ہے۔ کون اس حق کو پورا کرتا ہے اور کون اس بارگراں کی ادائیگی میں کوتاہی سے کام لیتا ہے۔ اور یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کس مستی میں ہیں۔ تو اے لوگو اس حالت کو ترک کرو اور ایمان لاؤ۔

(آیت ۱۴) دوسرا طغیان ۔۔۔ یہ کہ جب ان کے سامنے توحید ومعاد کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو طرح طرح سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس میں تبدیلی کر کے لاؤ تب ہم ماننے کے لیے تیار ہوں گے۔

یہ کتاب جس میں تم ہمارے الٰہ کی تردید کرتے ہو، اور ہمارے قوی نظریات کی تردید کرتے ہو، اگر تم کوئی ایسی کتاب لاؤ جو ہمارے قوی نظریات کے مطابق ہو تو شاید یہ مان لیں۔

(آیت ۱۵) [بدلہ] اگر یہی کتاب رکھتے ہو تو وعظ کرو، توحید کی باتیں کرو لیکن ہمارے الٰہ کی تردید نہ کرو۔ اگر تم تصنیف کر کے لاتے ہو، وہ ایسا ایسا ہو۔ کہنا یہ ہے کہ تم مفتری ہو اس لیے ہم نہیں مانگیں، تو اس کا جواب دیا جا رہا ہے کہ اس قرآن کو بدلنا تو درکنار، دوسرا قرآن تو لانا دور کی بات ہم اس

میں جزوی ترمیم بھی نہیں کر سکتے ، اس لیے کہ ہم رسول ہیں اور رسول اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ جو وحی کی جائے اسے ہم لوگوں تک پہنچا دیں۔

[ان عصیت] اس لیے اگر میں نافرمانی کر بیٹھوں گا تو میری پکڑ سب سے پہلے ہوگی۔ اس لیے کہ ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ کسی بادشاہ کا کوئی رسول اگر پیغام پہنچانے میں گڑ بڑی کرتا ہے تو اسے سب سے پہلے پکڑا جاتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ میں مفتری نہیں ہوں اس لیے میں اس کو نہیں بدل سکتا۔ اگر ایسا کر بھی دوں تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں عذاب الیم سے دوچار ہو جاؤں۔ رسول اپنے صادق ہونے کی دلیل دے رہے ہیں۔۔۔اور یہ آخرت کی آیتیں چل رہی ہیں۔

(آیت ۱۶) ایک آدمی جو کبھی تہمت نہیں لگاتا، تو وہ اچانک خدا کی طرف اس طرح کی باتیں منسوب کر دے گا۔ اور وحی کے نام سے منسوب کرنا شروع کر دے گا۔ آخر میں ہی تو تھا، جب میرے پاس کوئی چیز نہیں آتی اس وقت کسی سے کچھ نہیں کہتا تھا، ایک سیدھا سادھا آدمی تھا۔ لیکن خدائے تعالیٰ نے نبوت کے منصب سے سرفراز کیا تو میں یہ سب باتیں کر رہا ہوں۔ تو معلوم ہوا جو شخص پہلے اس صفت کا حامل رہا ہو تو وہ اچانک اس طرح کرنا شروع کر دے گا۔

[لا یعقلون] تو تم اس کو نہیں سوچتے ہو کہ میں ایسا ہو سکتا ہوں۔ کہنا یہ ہے کہ میں مفتری نہیں ہوں۔

(آیت ۱۷) اس آیت میں اللہ مخاطب ہے۔ اوپر کی آیتوں میں نبی کی زبان تھی، اور نبی کی زبان متانت، نرم اور دعوتی انداز سے پر ہوتی ہے۔ یہ خطاب خدائے تعالیٰ کر رہا ہے کہ تم مفتری ہو نبی مفتری نہیں ہے۔ مفتری کا مطلب یہ ہے کہ تم نے شرک کیا ہے اور اسے دین ابراہیمی قرار دے رکھا ہے۔ یہ تمہارا ایک جرم ہے۔

[او] بمعنی ''و''، دوسرا جرم یہ ہے کہ اللہ نے اپنا رسول بھیجا تو تم نے ان آیتوں کو جھٹلا دیا۔ دو جرم گنائے گئے۔ (۱) شرک کرنے والے ہو۔ (۲) آیتوں کو جھٹلاتے ہو۔

(آیت ۱۸) افتراء علی اللہ کی تصویر آ رہی ہے۔

[من دون اللہ] جو اللہ کی نظر میں بہت گھٹیا ہو۔ اللہ کی بندگی میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ بندگی کا حق کسی اور کا تھا، اور تم نے ان کو حق دے دیا ہے جو اختیار سے محروم ہیں۔ اور دونوں جہاں میں وہ بے بس ہیں۔ نہ وہ اس دنیا میں فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ آخرت میں۔

[قل] ان کے تصور اور ان کے غلط عقائد کا جواب دیا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ تمہارا تصور غلط ہے اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا تو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہوتا کہ فلاں بت خدا کے دربار میں شفاعت کرے گا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تم عالم بالغیب ہو۔

[سبحانہ] اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہ بلند و برتر ہے۔ اس تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں تو اللہ ان سے ناراض بھی ہے۔ اس لیے یہ بیزاری کی آیت بھی ہے۔

(آیت ۱۹) مشرکین عرب کہتے تھے کہ ہم لوگ ابراہیمی دین سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ شرک کا سلسلہ آج سے نہیں بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ اور جو دین تم پیش کر رہے ہو وہ غلط ہے۔ تمہاری دعوت توحید سے پر ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین نہیں، ابراہیم علیہ السلام کا دین تو ''شرک کا دین'' تھا، اس لیے ہم اسے ماننے سے باز رہیں گے۔۔۔۔۔ تو ان کے اس خیال کا جواب دیا جا رہا ہے، کہ نوع انسانی کے آغاز سے ایک ہی دین تھا، سب لوگ اسی کی پیروی کرتے چلے آ رہے ہیں۔۔ وہ دین توحید کا دین تھا۔ لیکن کچھ لوگوں نے اطاعت رب کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کر لی۔ یعنی اطاعت رب کے علاوہ کسی اور کی اطاعت ہونے لگی، کسی اور کی پوجا شروع ہو گئی۔ جب ایسا ہوا تو اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کرام بھیجتا رہا، وہ اس کی اصلاح کرتے تھے۔ یہ سلسلہ برابر چلا آ رہا ہے۔ اسی قانون کے مطابق نبی ﷺ مبعوث ہو کر آئے ہیں۔ رسول کے آ جانے کے بعد پھر یہی لوگ مخالفت کر رہے ہیں اور اپنے دین کو دین الٰہی قرار دے رہے ہیں۔ اور مخالفت کی انتہا ہو گئی ہے، ماننے کو تیار نہیں۔ ایسی حالت میں قانون الٰہی کے تحت ان پر عذابِ الٰہی آ جانا چاہیے تھا، ایسا کیوں نہیں ہو رہا ہے۔ اسی کا جواب دیا جا رہا ہے کہ اگر امہال کا قانون نہ ہوتا تو آج ان پر فیصلہ کا دن آ جاتا۔

[فیما] ان تمام مسائل میں جو قرآن سے ہٹے ہوئے ہیں۔

[امة] اطاعة۔ وما كان الناس الا اطاعة واحدة

[اختلاف] کسی صحیح راہ کو چھوڑ کر غلط راستہ اختیار کر لینا۔

(آیت ۲۰) قرآن کہتا ہے کہ دراصل قرآن ہی معجزہ ہے، تو وہ کہتے تھے یہ معجزہ نہیں ہے کوئی دوسرا معجزہ لاؤ۔ اس پر جواب مل رہا ہے کہ، غیب اس کے ہاتھ میں ہے، وہ چاہے گا تو بھیجے گا، نہیں چاہے گا تو نہیں بھیجے گا، پس تم انتظار کرو، یہ قرآن ہی معجزہ بن کر رہے گا۔

(آیت ۲۱) ان کی طغیانی کا ذکر ہے۔ [اذقنا الناس رحمة] اچھے حالات لاتے ہیں۔

[من بعد] قحط میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔اس کے بعد رحمت لاتے ہیں تو ان کی حالت اچانک بدل جاتی ہے۔

[مکر فی آیاتنا] ہماری آیتوں کو ناکام بنانے کے لئے خفیہ تدبیریں کرنے میں لگے ہیں کہ ہماری آیتیں لوگ نہ سنیں۔اور دعوت ناکام ہو کر رہ جائے۔تو کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے بارے میں بھی خفیہ تدبیر کر رہا ہے۔اس لیے کہ ہمارے لکھنے والے فرشتے لکھ رہے ہیں۔اس طرح ہمیں تمہاری خفیہ تدبیریں معلوم ہو جاتی ہیں۔اور تم ہماری تدبیروں سے ناواقف رہتے ہو۔اس لیے ہماری جو بھی تدبیر ہو گی بہت مضبوط اور منضبط ہو گی۔

(آیت ۲۲) تسییر : چلانا، کشتی والی طغیانی بتائی جا رہی ہے۔

[جرین] عرب تاجر بارہا کشتیوں پر سفر کرتے تھے۔

[احیط] ہلاک ہو جائیں گے۔

[من الشاکرین] ہو جائیں گے۔پھر نجات پا جانے کے بعد شرک کرنا شروع کر دیتے ہیں۔اور دعوت کی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔

(آیت ۲۳) [متاع الحیاۃ الدنیا] مفعول مطلق ہے۔یعنی نمتعکم متاع الحیاۃ الدنیا۔ مطلب یہ ہوا کہ تھوڑے دنوں بعد ہم اسے چھین لیں گے۔اصلاً جو بات کہنی ہے وہ یہ ہے کہ وہاں جب آؤ گے تو بدلا پاؤ گے۔

(آیت ۲۴) [اختلط] آپس میں مل جانا۔باب افتعال میں اشتراک بھی پایا جاتا ہے۔بہت سے ایسے ابواب ہیں جو اشتراک کا معنی ادا کرتے ہیں۔مثلاً اختصام۔

[زخرف] رونق،حسن،وزینت بالخضرۃ۔ [حصیداً] : چٹیل میدان کی طرح کھیتی کو کر دیا ہے۔وہ چاہتا تھا کہ آج کل میں اسے ہم کاٹ لیں گے۔

حیات دنیا فانی ہے جیسا کہ تم دیکھتے ہو،اور یہ سب حیات دنیا کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔

(آیت ۲۵) اور اللہ تعالیٰ دار السلام کی طرف دعوت دیتا ہے۔جہاں کہ انسان ہر طرح سے محفوظ رہے گا۔

[و یھدی من یشاء]: انسان با اختیار مخلوق ہے،ذی ارادہ ہے۔اس لیے جب وہ ارادہ کرے گا تو ہدایت پائے گا۔

(آیت۲۶)[للذین احسنوا] العافیة الحسنیٰ ہے۔اور مزید وہ رب فضل سے نوازے گا۔
اس کے بعد دونوں گروہوں کا انجام بتایا جا رہا ہے، اور اوپر کی آیتوں میں ان دونوں کا تذکرہ ہوا ہے۔

اس آیت میں مومنین کے انجام کا تذکرہ ہے کہ ان کے چہرے پر سیاہی نہیں ہوگی بلکہ خوشی کی جھلک ہوگی، اور نہ ان پر بے چارگی چھائی ہوئی ہوگی، اس لیے کہ وہ مجرم نہیں۔

(آیت۲۷)[والذین کسبوا] ان الذین کسبوا السیئات فجزائهم جزاء سیئة۔

خدائے تعالیٰ اس دن ان کے اعمال کے بدلے انھیں بدلہ دے گا۔ان کے چہرے پر ذلت چھائی ہوگی، اس لیے ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔اور اس دن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت وعصمت ان سے کھینچ لے گا۔ اس لیے وہ ذلیل ہی ہوں گے، اس لیے اس دن انہیں کوئی نہ بچا سکے گا۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، اور تاریک رات کے نہایت سیاہ ٹکڑے ان پر ڈال دیے گئے ہوں گے۔کانما مغشیة وجوههم قطعاً من اللیل المظلم۔۔۔ (مظلم) یہ لیل سے حال ہے۔

(آیت ۲۸) ان مجرمین کے لیے اس دن اگر کوئی سہارا ہو سکتا تھا تو ان شفعاء کا جن کی شفاعت پر ان کو ناز تھا۔لیکن ان کے شفعاء ان کی شفاعت کے بجائے ان سے جھگڑیں گے، اور اس دن اللہ ان کے درمیان تفریق ڈال دے گا، پھر ان سے ان کے شفعاء یہ صاف صاف کہہ دیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔۔۔ایک سہارا تھا وہ بھی ہاتھوں سے جا رہا ہوگا۔کہنا یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے تبری کریں گے۔

(آیت ۲۹) بلیٰ یبلو: دیکھنا جانچنا۔اس دن وہ دیکھ لیں گے کہ ہمارے عمل کی قدر آج کے دن کچھ بھی نہیں ہے، اور ہم اپنے حقیقی مولیٰ سے آملے جس کے ساتھ ہم شریک ٹھہراتے تھے۔دوسری طرف ان کے شرکاء ان سے غائب ہو جائیں گے۔

(آیت ۳۱۔۳۵) ان آیتوں میں ان کے مسلم عقائد کو تسلیم کروایا جا رہا ہے کہ تم جو عقیدہ رکھتے ہو اس کے برعکس تم اپنی زندگی گزارتے ہو۔اگر تم سے یہ پوچھا جائے کہ رزق کون دیتا ہے، اور کون احیاء واماتہ پر قادر ہے تو تم یہی کہتے ہو کہ ''اللہ''۔پھر تم سے پوچھا جاتا ہے کہ اس کائنات کا مدبر کون ہے تو تم جواب میں کہتے ہو کہ اللہ ہی تدبیر الامر کرتا ہے۔پھر تم سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ہدایت کا سرچشمہ کون ہے، کون انسانوں کو صحیح راہ دکھلاتا ہے تو تم جواب میں یہی کہتے ہو کہ اللہ راستے کی ہدایت دیتا ہے۔تو تم

ان تمام چیزوں کا اقرار کرتے ہوئے دوسروں کو کیوں شریک کرتے ہو، اور تمہاری عقل کس طرح الٹ کر رہ گئی ہے، ذرا تم نہیں سوچتے۔

(آیت ۳۱) ابطال شرک ہے۔ زندہ کون کرتا ہے، اور موت کون دیتا ہے۔ بعد ما کان میتاً وبعد ما کان حیاً۔

[یدبر] با قاعدگی کس کی طرف سے ہے۔ یہ تمہارے مسلم عقائد کے نتیجے ہیں۔ اگر نہیں مانتے تو تم اللہ کے عذاب کو دعوت دیتے ہو۔

[ماذا] پس جو تمہارا دین ہے وہ دین حق نہیں بلکہ وہ باطل دین ہے۔ اور تم نے جو راہ اختیار کی ہے وہ جان بوجھ کر کی ہے۔ اور تم اسے غلط سمجھتے ہو لیکن اپنانے سے باز نہیں آتے۔

(آیت ۳۳) [کذالك] کما حقت کلمة ربك علی هؤلاء الفاسقین فکذالك تحق کلمة ربك علی جمیع الفاسقین انهم لا یؤمنون۔ کذالك حقت کلمة ربك علی الذین فسقوا انهم لا یؤ منون۔

یہ جان بوجھ کر ضلال کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ان سے پوچھا جائے تو وہ اللہ ہی کا نام لیں گے۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ نامعقولیت پر اتر آئے ہیں۔ اس لیے اللہ ان فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ اور اضلال کا قانون ان پر نافذ ہو گیا ہے۔ ایسا اس لیے ہوا کہ یہ ہدایت کے طالب نہیں ہیں۔ جو ہدایت چاہتا ہے اسے ہدایت ملتی ہے۔

[الذین فسقوا] سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔

حقت سنة اضلال الله علی هؤلاء انهم لا یؤمنون

[کلمة الله] قانون اضلال، [انهم لا یؤمنون] کلمة اللہ کی تفسیر ہے۔

(آیت ۳۴) اب دوسرے انداز سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا تمہارے شرکاء میں کوئی ابداء خلق اور اعادہ خلق کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ شرکاء میں سے کسی کو نہیں مانتے تھے کہ وہ ابداء خلق یا اعادہ خلق کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کو ہی مانتے تھے۔ ''ابداء خلق اور اعادہ خلق' کا مطلب یہ ہے کہ اس نے عالم انسانیت اور عالم حیوانیت میں پیدا کرنا شروع کیا ہے اور کرتا جا رہا ہے۔ ابداء الامر اور اعادہ الامر سے یہ احساس دلانا ہے کہ وہ پوری کائنات کا نظم کرنے والا ہے۔ تو تم کس طرح مجنونانہ گفتگو کرتے ہو۔

(آیت ۳۵) [من یهدی] زندگی کی شاہراہ کون متعین کرتا ہے۔ تمہارے شرکاء ان تمام صفات

سے خالی ہیں۔ان میں نہ الوہیت کی صفت پائی جاتی ہے، نہ وہ محی وممیت ہیں اور نہ خالق کائنات ہیں۔ اور نہ وہ انسانیت کے لیے کوئی راستہ بتلا سکتے ہیں۔غرضیکہ وہ الوہیت کی ہر طرح کی صفتوں سے خالی ہیں۔تو آخر تم انہیں کس بنا پر شریک ٹھہراتے ہو۔کس عقل سے کام لیتے ہو کیا تمہاری عقل الٹ گئی ہے۔

چاہے جن ہوں یا فرشتے سب کے سب اس کے محتاج ہیں کہ انہیں کوئی دوسرا صحیح راستہ بتلائے۔تو تم کس طرح فیصلہ کرتے ہو۔ذرا بھی سوچتے نہیں۔

(آیت ۳۶)[ظناً] مظنوناً [اکثرھم] ھم کی ضمیر آبادی کی طرف جا رہی ہے۔

ایک خیال کر لیا ہے کہ کچھ الٰہ ہیں جن کی پیروی کرنی چاہیے، اسی کی پیروی کرتے جا رہے ہیں۔

[اغنی] عن : کسی کو فائدہ پہنچانا۔[اغنی] من : کسی کو قائم مقام بنانا۔

اس کی جگہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن باطل نظریات کچھ بھی نہیں کر سکتے۔یعنی یہ شرکاء کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ایک طرف حق ہے، دوسری طرف ظن پر مبنی خیالات ہیں، تو ان دونوں میں کس طرح مقابلہ ہو سکے گا۔

(آیت ۳۷) معلوم ہوا کہ حق تو یہ ہے کہ تمہارے عقیدے کے نتیجے میں بات سامنے آتی ہے۔اب کہا جا رہا ہے کہ جو تمہارا عقیدہ ہے تنہا تم ہی اس میں شریک نہیں ہو بلکہ اہل کتاب کا بھی یہی نظریہ ہے۔تو ان کا بھی جواب دیا جا رہا ہے، کہ یہ کوئی گڑھ کر نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ یہ منزل من اللہ ہے۔اور یہ قرآن تورات کی تعلیمات کے بالکل مطابق ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن تورات کی تصدیق کرنے والا ہے۔جو علامت بتائی جا رہی ہے یہ کتاب خود تمہارے تورات کی تصدیق کر رہی ہے۔اگر یہ نہ آتا تو تورات کی تصدیق کس طرح ہوتی۔اور تورات مجمل کتاب تھی لیکن یہ کتاب مفصل کتاب ہے۔تمہیں چاہیے تھا اسے پکڑتے۔لا ریب منزلا من رب العالمین۔

(آیت ۳۸) افتراء پردازی کا جواب دیا جا رہا ہے۔

جتنے بھی مخالفین ہیں چاہے یہود ہوں یا نصاریٰ، سب کے سب یہ مطالبہ کرو کہ اس طرح کوئی سورہ وہ لائیں، اگر وہ اس معاملے میں سچے ہیں۔

(آیت ۳۹)[بـــل] اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ یہ لوگ قرآن کی دعوت نہ سمجھ رہے ہوں، یا قرآن کی تعلیمات یا دلائل میں کوتاہی رہ گئی ہے، ایسا نہیں کہ اس کے دلائل عقل میں نہ آ رہے ہوں، بلکہ انھوں نے اس کو جھٹلا دیا ہے۔جس کو وہ نہیں سمجھ پا سکے، ان کی نگاہ اصلاً اسی دنیا تک محدود ہے،

اس لیے کہ وہ اس دن تک نہیں پہنچ سکے، اس کا علم ان کی عقل میں نہیں آتا۔ اس لیے یہ دلائل کو نہیں مان رہے ہیں اور ان کے سامنے پردہ پڑا ہوا ہے۔

[کـــذالك] سے ایک طرح کی دھمکی ہو رہی ہے۔ ڈرانا مقصود ہے۔ یہ انجام ان کے سامنے ہونا چاہیے۔ [فـانظر] کا خطاب دونوں طرح سے ہوسکتا ہے۔ اگر نبی کو مانا جائے تو تسلی ہوگی کہ اے نبی آپ دل گرفتہ نہ ہوں، ان کا انجام وہی ہوگا جو مکذبین کا ہوا ہے۔ اگر مشرکین کو مانا جائے تو ان کے حق میں انذار اور دھمکی ہے کہ اگر تم نہ مانو گے تو تمہارا انجام وہی ہوگا جو جھٹلانے والوں کا ہوا ہے۔

(آیت ۴۰) دل گرفتہ ہونے کی کیا بات ہے۔ اگر سب لوگ ایمان نہ لائے تو گھبرانے کی کیا ضرورت، کچھ تو ضرور ایمان لائے، کچھ تو ایسے ہوں گے جو ایمان نہیں لائیں گے۔ اگر وہ ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کی دعوت غلط ہے۔ بلکہ تمہاری دعوت بالکل صحیح ہے۔

[ربك] سے تسلی دینا مقصود ہے۔ خدائے تعالی ان سے نمٹ لے گا۔

(آیت ۴۱) تم جو عمل کر رہے ہو اس کے نتائج سے ہم دوچار نہیں ہوں گے۔ یہ بھی تسلی کا پہلو ہے۔ نبی یہ سوچتا ہے کہ اگر میں لوگوں کو نہ سمجھا سکا تو مجھ سے باز پرس ہوگی، اس لیے تسلی ہے۔ اور میں جو عمل کر رہا ہوں اس سے تم دوچار نہیں ہو گے۔

(آیت ۴۲) جب وہ نبی کی مجلس میں آتے ہیں تو دعوت کو بہت ہی غور سے سنتے ہیں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہدایت کے طالب ہیں۔ بظاہر حق والوں کو یہ دھوکہ ہوسکتا تھا کہ یہ غور سے سننے والے دعوت حق کے طلب گار ہیں۔۔۔ تو کہا جا رہا ہے کہ وہ ہدایت کے لیے نہیں سنتے بلکہ کیڑا نکالنے کے لیے سنتے ہیں، اور ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے اندر عقل نہیں۔

(آیت ۴۳) غور سے جو سنتے ہیں ہدایت کے لیے نہیں سنتے ہیں بلکہ برے مقاصد کے لیے سنتے ہیں۔ ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اندھے ہیں، جو قوت عقل اور قوت باصرہ ملی ہے وہ غلط طریقے سے استعمال کر رہے ہیں۔ اس کا جو صحیح مصرف تھا اس مصرف میں عقل و نگاہ کو نہیں لگاتے۔

(آیت ۴۴) وہ ظلم نہیں کرتا ہے۔ اس لیے انہیں قوت عقل اور قوت باصرہ عطا کی، ان کے پاس رسول بھیجا۔ اگر وہ اس دعوت کو نہیں مانتے تو ان کا قصور ہے اور یہ ان کی غلطی ہے۔ اور یہ ان کے سر ہے۔

[ولو كانوا لا يبصرون] اگر چہ وہ۔۔۔۔ حال واقع ہے۔

داعی کو شک ہوتا ہے یہ ہدایت کے طالب نہیں ہیں، اگر وہ ظالم ہوتا تو تمہیں ہدایت کا سامان نہیں

فراہم کرتا، تمہارے پاس نہ رسول بھیجتا، نہ قوت عقل سے نوازتا اور نہ ہی قوت باصرہ دیتا۔

(آیت ۴۵) اب چونکہ نہیں مان رہے ہیں اور دنیا پرستی میں غرق ہیں اس لیے ان کا حشر یہ ہوگا کہ جب قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے تو دنیا کی حقیقت ایسے ہی ہوگی جیسے وہاں ہم نے ایک گھنٹے ہی زندگی گزاری تھی۔ یعنی یہ کہ اس دن اس دنیا کی حقیقت ایک گھنٹے کے سوا کچھ نہ ہوگی۔

[كأن لم يلبثوا۔۔۔] حال، [يتعارفون بينهم] حال ہے يحشرهم کی ضمیر سے۔

انہیں ایسا محسوس اس لیے ہوگا کہ جہنم حاضر ہے اور جس چیز کو جھٹلاتے تھے وہ بھی سامنے ہے اور جو عذاب سامنے آنے والا ہے وہ ابدی ہے۔

[خسر الذين] خسروا في تجارتهم یہ لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔

[وما كانوا مهتدين] اخیر زندگی تک وہ ہدایت یافتہ نہ ہو سکے۔

(آیت ۴۶) مشرکین مکہ کو یہ بتلایا جارہا ہے کہ اگر تم اس دعوت کو جھٹلاؤ گے تو دونوں جگہ تمہارے لیے عذاب ہے، اور مومنین کے لیے دونوں جگہوں میں آرام ہے۔ مومنین کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ ان پر جلدی سے عذاب آجائے۔ یا کافرین مطالبہ کرتے تھے کہ تمہارے وہ وعدے کہاں ہیں جن کا اس سے پہلے ہونا تھا، اس کا تو اب وقت آگیا۔ تو اس آیت میں اسی کا جواب منقول ہے کہ اے نبی! جس کا وہ مطالبہ کرتے ہیں، یا اے مومنین جو تمہارے اندر یہ جذبہ ابھرتا ہے کہ ان پر جلدی سے عذاب الٰہی آجاتا، تو عذاب الٰہی ضرور آئے گا۔ اس کی دونوں صورتیں ہو سکتی ہے۔ پہلی صورت یہ کہ ہم ان پر عذاب بھیج دیں نبی کے رہتے ہوئے یا اس کی وفات کے بعد۔ اگر اس وقت عذاب الٰہی نہیں آرہا ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ چھوٹ جائیں گے، بلکہ وہ ہمارے پاس آئیں گے، وہ ہمارے فیصلے میں ہیں، جب مدت پوری ہو جائے گی تو عذاب الٰہی ان پر نافذ کر دیا جائے گا۔

[فالينا مرجعهم] لوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارے فیصلے میں ہے، ہم ان کو بدلہ دیں گے۔ تم اپنا کام کرو۔ وہ وعدے کب پورے ہوں گے، وہ اپنے وقت میں ہوگا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تمہاری زندگی میں دکھلا دیں یا مر جانے کے بعد ان وعدوں کو دکھلائیں۔

(آیت ۴۷) اوپر کی آیت میں مومنین کو سمجھانا مقصود ہے۔ اس آیت میں بھی تسلی دی جارہی ہے کہ ان پر وہی قانون نافذ ہوگا جو اگلی قوموں پر نافذ ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے جو رسول آئے تو خدا کی عدالت بن کر آئے، یہ بھی خدا کی عدالت بن کر آیا ہے۔

(آیت ۴۸) اوپر جو تمہید باندھی گئی تھی اس آیت میں اسی کا جواب ہے۔[اجل]عذاب۔

(آیت ۴۹) قدرت حاصل نہیں ہے۔اصل صاحب قدرت اللہ ہے۔وہ چاہے گا تو فیصلہ کرے گا۔میں عذاب لاؤں یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔[الا]منقطعہ ہے۔

میں عذاب یا قیامت کیسے لاسکتا ہوں، وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا،اسی کی مشیت ہے۔ یہ متی هذا الوعد الخ کا جواب ہے۔

[لكل امة اجل] وہ امت جس کے اندر رسول آیا اور اس کو قوم کے لوگوں نے جھٹلا دیا،تو انہیں مہلت دی جاتی ہے۔اور کتنے دنوں تک مہلت ملتی ہے اسے وہی جانتا ہے،اور جب مہلت ختم ہو جاتی ہے تو عذاب الٰہی آجاتا ہے۔مقررہ فیصلہ کے بعد جب پکڑے جائیں گے تو جہاں کہیں بھی ہوں گے وہیں پکڑے جائیں گے۔

بالکل یہی حال اس نبی کے ساتھ بھی ہے۔نبی ایک ''رجل'' بن کر آیا ہے، نبی اس وقت تک یہاں سے نہیں جاسکتا جب تک ایک مدت تک نہ پہنچ جائے۔

(آیت ۵۰)[بیاتا](الاول) بائتين أو قائلين (الثانی) ليلاً أو نهاراً۔ عذاب کے بارے میں کیوں جلدی مچا رہے ہو کیا عذاب میں کوئی لذت کی چیز موجود ہے،ایسا نہیں ہوگا۔

(آیت ۵۱)[أَ ثُمَّ] یہ ایمان لانا مضر ہوگا،نہیں ایسا نہیں ہوگا،اس وقت کا ایمان مضر ہوتا ہے۔أ یؤمنون الآن: اب ایمان لانے سے کیا فائدہ ہوگا۔

(آیت ۵۲) آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب ہے۔جو کمائی کی ہے وہ عذاب کی شکل میں ان کے سامنے ہوگی۔

(آیت ۵۳) یہ استہزاء کا انداز ہے۔اس لیے جواب ہے کہ ایسا ہوگا۔پھر جب آئے گا تو بھاگ نہیں سکتے۔

(آیت ۵۴) اس وقت وہ زمین کی ساری چیزوں سے اپنی جان کا فدیہ ادا کرنا چاہے گا لیکن ایسا نہیں ہوگا۔جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو دل میں پچھتائیں گے۔ندامت دل میں ہی ہوگی۔اسی لیے'' ندامت'' کے لیے'' اسر'' کا لفظ ہے۔

(آیت ۵۶) اسی کی حکمرانی ہوتی ہے۔اس کے قبضے میں تمام چیزیں ہیں،اس لیے اس کا وعدہ حق ہے لیکن مشرکین اس سے ناواقف ہیں حالانکہ اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور حساب دینا ہے۔

(آیت ۵۷) اس لیے اگر اس عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو اس قرآن کو اپناؤ، اسے مانو، یہ دلوں کو نرم کرتا ہے، اور انذار کرتا ہے۔ جب نرم ہو جاتا ہے تو عقائد کی بیماریوں کو شفا بخشتا ہے، اور صحیح راہ بتلاتا ہے، صراط مستقیم تک پہنچاتا ہے، اور ایسا سب کے لیے ہے۔ لیکن فائدہ وہی اٹھائیں گے جو اس پر ایمان لائیں گے۔ اس لیے کہ اسے استعمال کرنے کے لیے تیار نہیں اور ماننے کے لیے تیار نہیں۔

(آیت ۵۸) [بفضل اللہ و رحمتہ] فلیفرحوا بفضل اللہ و رحمتہ، فبذلک فلیفرحوا۔ مسلمانوں کو بشارت دی جارہی ہے۔ انھیں تو اللہ کی رحمت پا کر خوش ہونا چاہیے، کہ ان کے حصے میں اللہ کی رحمت آئی۔ اور ایسے خطاب مشرکین سے چل رہا تھا لیکن یہاں خطاب مومنین سے ہے، اس لیے کہ انہیں تسلی دینی ہے کہ جو چیز اور جس نعمت سے تم سرفراز کیے گئے ہو وہ نعمت اس مال سے بہتر ہے جو مشرکین جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

(آیت ۵۹) انھوں نے دنیا کی ہر چیز میں حرام و حلال قرار دے رکھا ہے۔ کچھ چیزیں اپنے شرکاء کے لیے خاص کر رکھی ہیں۔ اپنی طرف سے تحریم و تحلیل کرنا افتراء علی اللہ ہے۔

[من رزق] مولانا مودودیؒ نے رزق کا ایک وسیع مفہوم بتلایا ہے۔ دیکھئے سورہ یونس حاشیہ ۶۰ تفہیم القرآن جلد دوم

(آیت ۶۰) [و ما ظن الذین۔۔۔ یوم القیامۃ] سزا کا مسئلہ ہے۔ ان کا جو یہ گمان ہے کہ ہمارے شرکاء بخشوا دیں گے۔ اور یہ ابراہیمی دین ہے، تو ایسا نہ ہوگا بلکہ عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔ اللہ کا یہ فضل ہے کہ ان پر قرآن نازل فرمایا، لیکن یہ لوگ اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں۔

(آیت ۶۱) [شأن] متفکرانہ حالت کو شأن کہتے ہیں۔ [من قرآن] پورا حصہ یا جزو۔ ہمارا رسول کیا کرتا ہے، اور مخالفین کیا کرتے ہیں۔ ہم اس سے خوب اچھی طرح سے واقف ہیں، زمین کی کوئی چیز بھی ہم سے نہیں چھپی ہوئی ہے، یہاں تک کہ زمین کے ایک ایک ذرے کے بارے میں بھی خبر رکھتے ہیں۔ چاہے آسمان میں ہو یا زمین میں، ہر چیز کا ریکارڈ تیار ہے۔

[تفیضون] دعوت کو عام بنانے میں سرگرم عمل ہیں۔ افاضۃ فی الکلام کے معنی کرید کرنے کے آتے ہیں، اسی وجہ سے تعلمون میں خطاب مشرکین ہی سے ہے۔ (۶۱۔۔۔۶۲) تسلی کی آیت ہیں۔ دونوں جگہ ان کے لیے آرام ہے۔ یہ تو آخرت میں ہوگا۔ (آیت ۶۴) دنیا میں یہ ہوگا۔

[کلمات اللہ] وہ وعدے جو اللہ تعالیٰ نے کیے ہیں۔ یہ سب سے بڑی کامیابی ہے کہ یہ لوگ

دونوں جگہ کامیاب ہوں۔

(آیت ۶۲)[اولیاء اللہ] جنھوں نے اللہ کو اپنا ولی اور کارساز بنایا، اور اللہ نے انھیں اپنی ولایت میں لے لیا۔ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے، اور ولی اس کو خطرات سے بچاتا ہے اور نفع بخش چیزیں فراہم کرتا ہے۔ وہاں کسی بات کا خطرہ نہیں ہوگا۔ یہ ایک بہتر تغیر ہے کہ وہاں امن ہی امن ہوگا۔ وہ سرور و حُبور میں ہوں گے۔ وھم یحزون کا یہی مطلب ہے۔

(آیت ۶۳)[الذین آمنوا] اولیاء اللہ سے بدل ہوگا یا الذین آمنوا و کانو یتقون، مبتدا لھم البشری خبر ہے۔

[یتقون] اعمال صالحہ کثرت سے کرتے ہیں۔

(آیت ۶۴)[بشری] بالآخر اللہ کی نصرت ان ہی کو ملے گی۔ ان کی دنیا و آخرت دونوں ہی بنے گی اور کافرین دونوں جگہ تباہ ہوں گے۔

[لا تبدیل] کوئی مبدل طاقت نہیں رکھتا ہے کہ مومنین کے سلسلے میں جو وعدے کیے گئے ہیں، ان کو بدل ڈالے۔ لہٰذا مومنین کو یقین کرنا چاہیے کہ لذت و سرور دیا جائے گا۔

(آیت ۶۵)[قولھم] دھمکی آمیز کلمات۔ اگر اس نبی کو مانو گے تو جو تمہارا حال ہوگا تم ہی جانتے ہو۔ اقتدار ہمارے ہاتھ میں ہے۔

[ولا یحزنك] ہر ہر شخص سے خطاب ہے۔ وہ تمہارا کچھ نہیں کر سکتے، اس لیے کہ جب خدا کے فیصلے سے کسی کا فیصلہ ٹکراتا ہے تو وہ فیصلہ پاش پاش ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ عزیز ہے۔ اس لیے اس کو کوئی نہیں بدل سکتا اور اس عزیز کا وعدہ تمہارے لیے ہے۔ "لکم البشریٰ" تو یہ ضرور پورا ہوگا۔

[السمیع العلیم] جہاں کہیں کوئی ہوتا ہے اسے دیکھتا ہے۔ مکہ میں کون کیا کہتا ہے۔ ایک گروہ نے لا الہ الا اللہ کہا ہے دوسرا گروہ شرک کرتا ہے۔ ان سب چیزوں سے وہ واقف ہے۔ ''سمیع'' کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مصیبت کو سن کر مدد کے لیے دوڑتا ہے۔ "قد سمع اللہ تحاورکما" میں یہی مفہوم ہے کہ اس نے سن لیا جو مسئلہ درپیش ہے، اس کو حل کرے گا۔ وہ جانتا ہے کہ تم لوگ مستحق ہو یا نہیں۔ یہ تبشیر کا کلمہ ہے۔

وہ لوگ یہ کہتے تھے کہ ہم انھیں کو اکھاڑ پھینکیں گے۔ اس لیے مومنین غم نہ کھائیں گے۔ تم لوگ اکھاڑ نہیں پھینکے جاؤ گے۔ ہم جسے چاہتے ہیں اسے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ اس لیے ہم تمہیں اکھاڑ نہیں

پھینکیں گے بلکہ انھیں اکھاڑ پھینکیں گے۔ وہی حامی و ناصر ہے۔ ایسے موقع پر سمیع وعلیم کا یہی مطلب ہوتا ہے۔

(آیت ٦٦) اس کا اقتدار پورے عالم پر ہے۔ جو لوگ اس مقتدر کی الوہیت تسلیم کرتے ہیں، یعنی مومنین نے جس ہستی کو اپنا مولیٰ اور اس کی بندگی کا حق تسلیم کیا ہے، وہ عزیز ہے۔ اور انھوں نے جن ہستیوں کو شریک ٹھہرایا ہے یہ سمجھتے ہوئے کہ ہماری بگڑی بنا دیں گے، تو ایسا نہ ہوگا۔ ایک طرف ایک ذات ہے جو عزیز السمٰوات والارض ہے، دوسری طرف ان کی خیالی ذات ہے۔ تو یہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔ ان دونوں کا کیسے مقابلہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ تمہیں اکھاڑ نہیں پھینک سکتے۔ یہ جن شرکاء کو پکارتے ہیں وہ ہمارے اقتدار میں حقیقتاً شریک نہیں۔ اور تم جس خدا کو پکڑے ہو وہ حقیقتاً خدا ہے۔ اس لیے وہ تمہیں کامیاب کرے گا۔ یہ لوگ تمہیں اکھاڑ نہیں پھینک سکتے۔ یہ توحید کی ایک آیت ہے۔ (١٤)

(آیت ٦٧) [مبصراً] لتشتغلوا من فضلکم: قرآن کا یہ تقابل بہت ہی مشہور ہے۔ یہ بتلایا جا رہا ہے کہ یہاں سے وہاں تک ایک ہی مدبر ہے۔ وہ رؤف ورحیم ہے کہ اس نے ہماری زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے، آرام کرنے کے لیے رات بنائی، حاجتوں کو پورا کرنے کے لیے دن بنایا۔ جب وہ ایسا کرتا ہے تو یقیناً ایک دن قیامت کا لائے گا۔ یہ الوہیت کی دلیل بتلائی ہے کہ قرآن کی دعوت صحیح ہے۔ یہ توحید کی آیت ہے، پھر توحید سے اس کا رخ معاد کی طرف ہے۔ توحید کا جو اصلا تصور ہے وہ معاد ہی ہے۔

(آیت ٦٨) تقاضا تو یہ ہے کہ اس کی پرستش کی جائے لیکن تمام لوگ یعنی یہود، نصاریٰ، مشرکین اللہ کے لیے بیٹا منتخب کرتے ہیں، حالانکہ وہ اس سے بالکل بے نیاز ہے۔ وہ قادر ہے اس کے پاس سب چیز ہے۔ کسی کو ہلاک کرنا چاہے تو اس میں وہ کسی کا کوئی محتاج نہیں۔ غنی ایک بہت ہی جامع لفظ ہے۔ ان کے پاس شرک کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ بہت بڑا جرم ہے۔

(آیت ٦٩) جو شرک کرتے ہیں وہ فلاح کی راہ نہیں پا سکتے۔

(آیت ٧٠) ان کا انجام یہ ہوگا۔

[متاع] لھم متاع فی الدنیا۔

(آیت ٧١) اب تاریخی دلیل دی جا رہی ہے کہ دنیا کا یہ دستور رہا ہے کہ وہی لوگ اب تک

کامیاب ہوئے ہیں جو رسول کی بات مانتے ہیں۔اور جو اسے جھٹلا دیتے ہیں وہ ناکام ہوتے ہیں۔

قام ب: انجام دینا، [مقامی] بآیات اللہ۔ میں اللہ کے احکام پر عمل کرتا ہوں اور اس کی دعوت دیتا ہوں۔

[مقامی] اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ایک رہنے کے معنی ہیں، دوسرے انجام دینا، اس پر عمل پیرا ہونا۔

[اجمع] الامر، پکا فیصلہ کرنا۔

[و شرکاء] مفعول معہ [غمّہ] مشتبہ۔التباس نہ رہے کہ کریں یا نہ کریں۔تردد نہ کرو۔کچھ پر فوراً نافذ کردو۔کہنا یہ ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ ہے اس لیے تمہارے شرکاء ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔

(آیت۷۲) تولی کیوں کرتے ہو۔میں تو تم سے کچھ اجر کا طالب نہیں ہوں۔سورہ مومنون میں آیا ہے کہ اس کی دعوت اس لیے ہے کہ یہ لوگوں میں فضیلت حاصل کرلے۔تو کہا جا رہا ہے کہ میں انفاق کی دعوت اس لیے نہیں دیتا کہ اسے بٹور کر خود رکھ لوں، نہیں بلکہ اس کا اجر اللہ کے یہاں ملے گا۔

[من المسلمین] موحدین

(آیت۷۳)[فکذبوہ] اخیر تک ایمان نہیں لائے [منذرین] دعوت کو پیش کرنے میں انھوں نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی۔

(آیت۷۴)[بما کذبوا] جس بنیاد پر پہلے دن جھٹلایا تھا آج بھی اسی بنیاد پر جھٹلا رہے ہیں۔بسبب الذی کذبوا من قبل ۔ جو لوگ ظلم کرتے ہیں ان کے دل اس حالت میں نہیں ہوتے کہ ایمان لائیں۔

(آیت۷۶) پورا فیصلہ اس میں درج ہے۔دعوت دی گئی، مان کر نہیں دیا پھر ہلاک کر دیے گئے۔

[الحق]فی الحق: ساحر کامیاب نہیں ہوا کرتے۔اگر میں ساحر ہوں تو یقیناً میری کامیابی نہیں ہوگی۔

(۸۳)آمن ب اور لہ میں فرق ہے،''ب'' کتاب کے لیے آتا ہے لیکن ''ب'' اور'' لام'' دونوں رسولوں کے لیے آتا ہے '' ل'' کی صورت میں معیت اور ساتھ دینے کے ہوتے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ آمن بہ و آمن لہ میں یوں فرق بیان کرتے ہیں''عربی زبان کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ آمن له اور آمن به میں بڑا فرق ہے۔آمن له تو یہ ہے کہ آپ کسی شخص کے

دعوے یا اس کی خبر کو سچ مان لیں۔اس کے لیے حوالگی، تفویض، تسلیم اور انقیاد و اطاعت شرط نہیں، لیکن آمن له کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے آمن به کے تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔اس مرحلے تک کچھ اسرئیلی نوجوانوں نے حضرت موسیٰؑ کے دعوے کی صداقت تو تسلیم کر لی تھی لیکن ابھی آمن به کے مقام تک وہ نہیں پہنچے تھے اس وجہ سے ان کے اعتراف وقبولیت کو قرآن نے آمن له سے تعبیر کیا ہے۔(تدبر قرآن جلد ۴ ص ۷۹)

مولانا مودودی لکھتے ہیں:''ایمان کے ساتھ جب لام کا صلہ آتا ہے تو بالعموم اطاعت وانقیاد کے معنی دیتا ہے، یعنی کسی کی بات ماننا اور اس کے کہے پر چلنا''(تفہیم القرآن جلد ۲ حاشیہ ۷۹) مولانا مودودیؒ ایمان کی تشریح مزید اس طرح کرتے ہیں اور اسے کھول بیان کرتے ہیں اور قرآنی آیات سے استشہاد بھی پیش کرتے ہیں۔اس کی مزید تشریح سورہ العصر میں کرتے ہیں:

''یہ لفظ اگرچہ بعض مقامات پر قرآن مجید میں محض زبانی اقرار ایمان کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے (مثلاً النساء، آیت:۱۳۷، المائدہ، آیت:۵۴، الانفال، آیت: ۲۰، ۲۷، التوبہ، آیت: ۳۸، اور الصّف، آیت: ۲ میں) لیکن اس کا اصل استعمال سچے دل سے ماننے اور یقین کرنے کے معنی ہی میں کیا گیا ہے اور عربی زبان میں بھی اس لفظ کے یہی معنی ہیں۔لغت میں آمن له کے معنی صدقه و اعتمد عليه (اس کی تصدیق کی اور اس پر اعتماد کیا) اور آمن به کے معنی ايقن به (اس پر یقین کیا)۔قرآن دراصل جس ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیتا ہے، اس کو ان آیات میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے:

انما المومنون الذين آمنوا بالله و رسوله ثم لم يرتابوا (الحجرات۔۱۵) مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ پڑے۔

ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا (حٰم سجدہ۔۳۰) جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ڈٹ گئے۔

انما المومنون الذين اذا ذكر الله وجلت قلوبهم (الانفال۔۲) مومن تو حقیقت میں وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں۔

والذين آمنوا اشد حبا لله (البقرہ ۱۶۵) اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔

فلا و ربك لا يومنون حتى يحكوك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في انفسهم

حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیما (النساء۶۵) پس نہیں،(اے نبی) تمہارے رب کی قسم وہ ہر گز مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں تمہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔ ان سے بھی زیادہ اس آیت میں زبانی اقرار ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصل مطلوب حقیقی ایمان ہے نہ زبانی اقرار: یا ایھا الذین آمنوا آمنوا باللہ و رسولہ (النساء۱۳۶) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔ (تفہیم القرآن، سورہ العصر جلد ششم حاشیہ ا)

(آیت ۷۹) [کل ساحر]: بڑے بڑے ساحروں کو بلاؤ۔

(آیت ۸۰) وقت مقررہ پر لوگ ''یوم الزینۃ'' کو اکٹھا ہوئے، اور موسیٰ علیہ السلام نے یہ تقریر کی۔ دوسری جگہ پر آیا ہے کہ پہلے انھوں نے کہا ہے، لیکن یہاں پر اختصار ہے۔

(آیت ۸۱) تمہاری لاٹھی جادو ہے۔ میری لاٹھی اسے باطل کر دے گی۔ یہیں قبطی قوم میں دعوت کا دروازہ کھلتا ہے۔ جب ساحر ایمان لائے، انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ فرعون کو کھلی شکست ہوئی ہے۔ اس وقت انھوں نے کہا تھا ''انا اول المسلمین'' یعنی قبطی قوم میں یہی لوگ اسلام کا دروازہ کھولنے والے ہیں۔

(آیت ۸۲) اپنے تکوینی فیصلہ کے ذریعہ حق کو حق کر دیتا ہے، غالب کرتا ہے۔ وہ مخالفت کریں گے لیکن بالآخر حق غالب آ جائے گا۔ یہ سب باتیں صحابہ اور حضور ﷺ کے پیش نظر سنائی جا رہی ہیں۔

(آیت ۸۳) [من قومہ] موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے کچھ نوجوان ایمان لائے، انھوں نے ساتھ دیا۔ بوڑھے لوگ ساتھ دینے سے ڈر گئے۔ ''ابن کثیر'' قومہ کی ضمیر کو فرعون کی طرف لوٹاتے ہیں۔

[ما آمن لموسیٰ] فی اول ا مر دعوتہ۔ ابتداء دعوت میں ساتھ نہیں دیا۔

فرعون جیسے جبار کے دور اقتدار میں بوڑھوں کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ ایسا کر سکیں۔ لیکن نوجوانوں کے اندر خون گرم ہوتا ہے۔ باوجود اس کے کہ فرعون کا خوف لگا ہوا تھا، وہ جانتے تھے کہ فرعون موسوی دین سے پھیرنے کی کوشش کرے گا، ان تمام باتوں کے باوجود انھوں نے ساتھ دیا۔ ایسا نہیں کہ وہ ڈرتے ہوئے موسوی دین پر قائم رہے اور موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا۔ نہیں بلکہ انھوں نے سمجھ لیا کہ اگر ہم اس دین کو اپناتے ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیتے ہیں تو فرعونی عذاب سے نہ بچ سکیں گے۔ مختصر طور پر یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کی جرأت کو سراہ رہا ہے۔ ان کے اس عمل کی تعریف کر رہا ہے کہ ایسے

موقع پر موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا، وہ جانتے تھے کہ ہمارے ساتھ ایسا ایسا کیا جائے گا۔''الثانی''موسیٰ علیہ السلام پر کچھ ہی لوگ ایمان لائے، فرعون کی قوم میں سے۔(ابن کثیر)

[ان یفتنهم] علی خوف کا مفعول ہے۔[لعال] کہ پورے عالم پر چھایا ہوا ہے۔نزدیک میں چھوٹی چھوٹی جتنی سلطنتیں تھیں سب پر اس کا قبضہ تھا۔افریقہ تک اس کی حکومت ہوتی تھی۔

وہ حد سے گذرنے والا تھا، وہ کسی حد پر ٹکنے والا نہیں تھا۔وہ خدا کا باغی تھا۔اس لیے بنی اسرائیل میں سے کچھ ہی لوگ ساتھ دے سکے۔اس کے بعد یہ دعوت مصر میں چالیس سال تک دی جاتی رہی اور اس پورے عرصے میں موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی اصلاح کرتے رہے، اور قبطی قوم میں دعوت کو عام کرتے رہے۔پھر اخیر میں بیشتر لوگ آپ کے گرد اکٹھا ہو گئے۔پھر مسلم جماعت اپنی جگہ اپنی اصل حالت کی طرف لوٹ آئی۔

جب موسیٰ علیہ السلام کی تقریروں میں ''یا قوم'' ہوتا ہے تو اس سے ہر شیخ وشاب مراد ہوتے ہیں۔ وہ تمام لوگ اس میں آجاتے ہیں۔وہ پہلے سے مسلمان تھے۔

(آیت ۸۴)[توکلوا] مادی ذرائع تمہارے پاس نہیں ہیں اور فرعونی اقتدار تمہیں ستانے کے لیے تیار ہے، اس لیے اللہ پر بھروسہ کرو، اس کی کارسازی، اس کی وکالت پر ایمان لاؤ۔ یہاں پر دو شرطیں استعمال کی گئی ہیں جن کا واحد مقصد یہ ہے کہ کلام پر زور دیا جائے۔یعنی اگر تم عقیدے کے پکے ہو اور عمل کی گواہی پیش کرتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، توکل علی اللہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس پر یقین کرو۔

(آیت ۸۵)[فتنة] اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیں ستا ستا کر دین حق سے نہ پھیر دیں۔یہ مصدر بمعنی مفعول کے ہے، یعنی مفتنونین۔تو اے خدا تم ہمیں مفتون نہ بنانا۔یعنی یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں۔''لاجل تعذیب''۔

ہم پر تو صبر انڈیل دے، ان کے امتحان سے علیحدہ کر دے۔وہ اپنی راہ میں ناکام ہو جائیں اور ہم ان کی راہ میں پہاڑ بن جائیں۔

(آیت ۸۷) یہ حکم اس وقت اترا جب بنی اسرائیل فرعونی اقتدار میں پوری طرح جکڑ دیے گئے تھے۔جس علاقے میں بنی اسرائیل آباد تھے اسے فرعون نے اپنے دائرۂ اختیار میں لے لیا تھا۔ان سے اعمال شاقہ کرواتا، ان سے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرواتا۔اس لیے کہا جا رہا ہے تم دونوں بنی اسرائیل کے لئے مصر میں کچھ گھر کرایہ پر لے لو اور ان کو وہاں سے منتقل کراؤ۔اور یہ ان کی اصلاح وتربیت کا مرکز ہو۔

[قبـــــلة] مرکز، اور صبر حاصل کرنے کے لیے نماز قائم کریں، اور دورِ غلامی میں رہتے ہوئے جو اضمحلال پیدا ہوگا ہے اسے دور کرو۔ اسی کو بشارت سے تعبیر کیا ہے۔

جب جور وستم زیادہ ہوگیا تو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو حکم ملا کہ مصر میں کچھ گھر بنوائیں اور اس کے بعد بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ ان گھروں کو تعلیم وتربیت کا مرکز بنائیں۔

[و بشـــر الـمـو مـنيـن] ایسی چیزیں بیان کرنا جس سے ان کا اضمحلال دور ہوجائے، پژمردگی ختم ہوجائے۔ ستم کا جو اثر ہے وہ خطبے سے ختم ہوجائے۔

(آیت ۸۸) موسیٰ علیہ السلام خدائے تعالیٰ سے دعا کررہے ہیں تو نے انھیں جاہ وحشم دے رکھا ہے، تو کیا ان کا یہی مقصد ہے کہ ان کے بل بوتے پر لوگوں کو راہ راست سے بھٹکاتے پھریں۔ آپ نے دیا تھا تاکہ یہ لوگ شکر گذار بندے بنیں، لیکن یہ لوگ غلط طریقے سے استعمال کر رہے ہیں۔ "لیـضـلـوا" یہاں پر اسی لیے آیا ہے۔ جس طرح کوئی کہے کہ "ہم نے اس لڑکے کو پالا تھا تاکہ اس دریا میں ڈوب کر مر جائے گا۔"

اس لام کو علت کا لام نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ نتیجہ کا لام ہے۔

[اطـمـس] جس بنیاد پر یہ لوگوں کو بہکا رہے ہیں، اسے ہلاک کردے اور ان کے دلوں کو باندھ دے تاکہ وہ ہدایت یاب نہ ہوسکیں۔ یہ موسیٰ علیہ السلام بددعا نہیں کررہے ہیں بلکہ آپ رپورٹ دے رہے ہیں کہ دعوت کا دروازہ بند ہو چکا۔ جو آپ کا وعدہ ہے ان اہل ضلال کے لیے وہ پورا ہوگیا، وہ وقت آ گیا۔ جو مکھن نکالنا تھا ہم نے نکال لیا یہ سب جھاگ ہیں۔ اب آپ کا ان پر قانون عذاب نافذ ہونا چاہیے۔ یہ ایمان لانے کو نہیں یہ عذاب الیم کے مستحق ہیں۔

(آیت ۸۹) [اُجیبـــت] ایسا ہی ہوگا تم دونوں کی دعا قبول کرلی گئی۔ اصلاً خطاب دونوں پیغمبروں سے ہے لیکن اس طرح پوری قوم کو خطاب کرنا مقصود ہے۔ اس کے بعد تم زمین کے وارث بنائے جاؤ گے تو تم جادۂ حق پر رہنا۔ اقتدار سے نوازے جانے والے ہو اس لیے فاسقوں اور فجار کی راہ نہ اختیار کرنا۔

(آیت ۹۰) ایک آدمی جس طرح اپنے بچے کو گود میں لے کر پار کرتا ہے، اسی طرح ہم نے بنی اسرائیل کو باہر کردیا۔

[بـغيـا و عدوا] ان کے ظلم وزیادتی کی حد ہوچکی کہ وہ ہجرت کے وقت بھی ظلم کرنے سے باز نہ رہے۔

[غرق] پانی آپس میں مل گیا۔

(آیت۹۲)[ننجيك] یہ طنزاً ادا ہو رہا ہے کہ ہم تمہیں قیامت تک کے لیے محفوظ کرلیں گے تا کہ قبطی قوم اس سے نصیحت حاصل کرے۔لفظ عام ہے اس میں تمام لوگ آسکتے ہیں۔

[من الناس] مشرکین، یہ ان کا انجام ہوا جنھوں نے موسوی دعوت کو جھٹلایا۔

(آیت۹۳)[و لقد بوأنا بني اسرائيل] و لقد كرمنا تكريماً ۔اقتدار سے نوازا۔

[مبو أصدق] باعزت مقام دیا۔[رزقنا هم]خوشحالی بھی دی۔

موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے صحابی اقتدار کو قائم رکھا۔ یہ سلسلہ داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام تک چلتا رہا۔

[فما اختلفوه] یہاں سے ایک اعتراض کا جواب ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ بنی اسرائیل اس دعوت کی کیوں مخالفت کر رہے ہیں۔تو کہا جا رہا ہے کہ یہ جان بوجھ کر اس راہ کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ دنیا پرست لوگ ہیں۔ باوجود کہ ان کے پاس ''علم'' آچکا ہے،تورات ان کے سامنے موجود ہے،لیکن اس راہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔

[حتى جاء هم العلم]،اس کے آجانے کے بعد مخالفت کر رہے ہیں۔صرف دنیا پرستی کے لیے یہ ایسا کر رہے ہیں۔اب تسلی دی جا رہی ہے اس لیے کہ تمام لوگ مخالفت پر تل گئے ہیں۔

(آیت۹۴)شک،شبہہ،انکار،کشاف کے یہاں۔ یہاں پر شک کو مان لیا کہ نبی سے ایسا ہوسکتا ہے۔

[كنت] امت سے خطاب (مسلمانوں سے) جو مشرکین سے متاثر ہو رہے ہیں۔یا مخالفین سے خطاب ہے۔

[مما انزلنا اليك] حالانکہ یہ کتاب ہر شخص کے پاس آئی ہے۔

[الذين يقرء ون] ان سے پوچھو جن پر کتاب پہلے نازل ہوئی،وہ پڑھتے ہیں۔یعنی وہ صلحاء یہود جو دنیا پرست نہیں ہیں ان سے جا کر پوچھو کہ قرآن کی خصوصیات اور نبی کی خصوصیات کے بارے میں ان کی کتاب میں درج ہے۔

[جاء ك] یہ صحیح آسمانی کتاب ہے۔کسی چیز کی آمیزش نہیں۔اس لیے شک کر کے کٹ حجتی نہ کرو۔

افتراء، شک کرنا، جب شک کریں گے تو حجت کریں گے۔

(آیت ۹۵) فلا تکونن کا جواب فتکون ہے۔

ان دونوں آیتوں میں نبی سے خطاب ہے۔ نبی کو خطاب کر کے مومنین کو بتلایا جا رہا ہے، اس لیے کہ وہ نمائندہ ہے۔ اور نمائندگی اس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کر جائے۔ اس لیے اوپر کی آیتوں میں نبی کو شک نہیں ہو سکتا۔ نہ فرضاً اور نہ کسی طریقے سے۔ مخالفت کی وجہ سے شک نہیں ہونا چاہیے، ورنہ تم مکذبین کے نتائج سے دو چار ہو گے۔ اس کو یکسوئی کے ساتھ اپناتے رہو۔ مخالفین کی طرف کان نہ دھرو۔

(آیت ۹۶) اس آیت میں یہ بتلایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ ایمان لانے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ اس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے، اللہ تعالیٰ انہیں ایمان کی توفیق نہیں دیتا۔ اور جو لوگ اسے مانیں گے وہ نجات پائیں گے۔ یہاں ''کلمہ'' سے مراد قانون اضلال و ہدایت ہے۔

(آیت ۹۶۔۔۹۷) [لا یؤمنون] حتی یروا العذاب الالیم [و لو جاء تهم کل آیة] ۔ یہ لوگ عذاب الٰہی کے مشاہدہ تک ایمان نہیں لائیں گے۔ گر چہ اس سے پہلے ان کے سامنے بڑی بڑی آیتیں پیش کر دی جائیں۔ اور عذاب الٰہی کے وقت ایمان لائیں گے جس طرح فرعون ایمان لایا لیکن یہ ایمان معتبر نہیں۔

(آیت ۹۸) ان سے کہا جا رہا ہے کہ عاد و ثمود کی روش پر کیوں چلتے ہو۔ ''قوم یونس'' کی روش اختیار کرو، وہ عذاب الٰہی سے پہلے ایمان لانے کو تیار ہو گئے ۔ تاریخ انسانی میں ایسی قوم نہیں ہوئی جو ایمان لائی ہو اور نافع ہو سوائے قوم یونس کے۔ قانون الٰہی کو یہاں نہیں توڑا گیا ہے بلکہ قانون کے مطابق ہے کہ وہ رویت سے پہلے ایمان لائی۔ قصہ یوں ہے کہ یونس علیہ السلام نے جب دیکھا کہ قوم ایمان لانے کو نہیں، جھٹلاتے چلی جا رہی ہے۔ یہ ستم آپ سے نہیں دیکھا گیا، اور غیرت حق کی وجہ سے بغیر اذن الٰہی کے قوم کو چھوڑ دیا۔ جب ساحل پر آئے تو کشتی تیار تھی چنانچہ آپ جہاز پر سوار ہو گئے۔ جہاز پر اتنے لوگ سوار ہو گئے تھے کہ جہاز کا توازن جاتا رہا۔ اب ان میں سے کون چاہتا کہ ''میں جہاز سے سمندر میں پھینک دیا جاؤں اس لیے قرعہ اندازی ہوئی۔ اس قرعہ میں آپ کا نام نکل آیا، اس کے بعد آپ کو لوگوں نے سمندر میں پھینک دیا۔ اب تک آپ کے اندر انابت نہیں آئی ہے۔ جب مچھلی کی پیٹ میں پہنچ جاتے ہیں تو اس وقت اپنے رب ذوالجلال سے دعا کرتے ہیں۔ اس وقت انہیں اپنی غلطی کا

احساس ہوتا ہے۔اس کے بعد مچھلی انھیں رب کے حکم سے ساحل کے کنارے ڈال دیتی ہے۔مچھلی کے پیٹ سے نکل کر باہر آنے سے انسان آدھا مردہ ہو جاتا ہے،ایسی ہی حالت آپ کی ہوگئی تھی۔ایسی صورت میں خدائے تعالیٰ نے آپ کے لیے فوراً کدو کی بیل اُگا دی،اور آپ اس کے سائے میں رہتے رہے۔دوبارہ زندگی پانے کے بعد قوم کا رخ کیا،چلیں قوم کس حالت میں ہے۔

دوسری طرف قوم کو احساس ہوا کہ نبی جو ہمارے درمیان ایک سچا آدمی تھا،آخر ہم اسے کیوں جھٹلاتے رہے۔ان کے اندر ایمان کا جذبہ پیدا ہوا،اور یونس علیہ السلام کے گھر آئے تو معلوم ہوا کہ یونس علیہ السلام نہیں ہیں،کہیں چلے گئے ہیں۔وہ کسی میدان میں چلے جاتے ہیں اور ان پر ایمان لاتے ہیں،اور یہ دعا کرتے ہیں کہ اے رب ہمارے رب ہمارے درمیان تمہارا نبی نہیں ہے،ہم ایمان لاتے ہیں،لیکن تیرے حکم پر کیسے عمل پیرا ہوں۔یہ وہ طویل قصہ ہے جو حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔

فـلـو لا جب ماضی پر داخل ہوتا ہے تو ہونا چاہیے کے معنی دیتا ہے۔لیکن ایسا نہیں ہے اس میں ''ف'' کی تفریع کی ہے۔یعنی نتیجہ کی۔جس طرح اوپر کی آیت میں مذکور ہے اسی طرح اس آیت میں ایک دوسرے انداز سے یہ بات کہی جا رہی ہے۔تو اس روئے زمین پر کوئی ایسی قوم نہیں گزری جو عذاب الٰہی سے پہلے ایمان لے آئی ہو۔اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''ایسا کیوں نہیں ہوا کہ کوئی قوم ایمان لاتی اور یہ ایمان نافع ہوتا۔یعنی ایسے وقت میں ایمان لاتی جس میں وہ نافع بن کر آتا لیکن قومیں اس وقت ایمان لاتی ہیں جب کہ عذاب الٰہی کو دیکھ لیتی ہیں۔اس لیے وہ ایمان نفع بخش نہیں ہوتے۔اگر کوئی ایمان نفع بخش ہوتا ہے تو اس وقت ہوتا ہے جب قوم عذاب الٰہی کو دیکھنے سے پہلے ایمان لے آتی،اور ایسا تاریخ انسانی میں کبھی نہیں ہوا۔لیکن قوم نوح وہ واحد قوم ہے جو عذاب الٰہی کو دیکھنے سے پہلے ایمان لے آئی، یہی وجہ تھی کہ ایمان لانے کے بعد ان سے دنیاوی عذاب کو ٹال دیا گیا،اور انھیں ایک وقت مقررہ وقت تک زندگی بسر کرنے کے لیے سامان زیست دیا گیا۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان لانے کے بعد قوموں کی زندگی بڑھ جاتی ہے۔

(آیت۹۹) [و لـو شـاء] الله الا كراه نبی کو تسلی دی جا رہی ہے،مخالفین کو یہ بتلایا جا رہا ہے کہ ایمان اس وقت نصیب نہیں ہوگا جب تک تم ایمان لانے کے لیے تیار نہ ہو جاؤ۔اگر ایسا ہوتا تو نبی کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی،پھر اس کے ساتھ ساتھ رائے کی آزادی کیوں دی جاتی۔

(آیت۱۰۰)[لا يعلمون] صحیح عقل سے نہیں سوچتے۔

[بـاذن الـلـه] اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ ایمان لانے کے لیے ارادہ نہیں کر لیتا اس وقت خدائے تعالیٰ کی طرف ایمان کا اذن نہیں ہوتا ہے۔ اگر وہ تیار ہو جاتا ہے تو خدا کی طرف سے اذن ہو جاتا ہے۔

(۱۰۱) توحید و معاد کی کتنی نشانیاں ہیں، ذرا غور و فکر نہیں کرتے، یہ نبی کا جملہ ہے اور بہت ہی نرم جملہ نبی کی زبان سے ادا ہو رہا ہے، اس کے بعد خدائے تعالیٰ کی طرف سے ادا ہو رہا ہے جس میں سختی اور درشتی ہے۔ یعنی یہ کہ ایمان لانے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں۔ عدم ایمان پر مصر ہیں۔ ان ''آیات'' اور ''نذر'' سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

(۱۰۲) [یـوم اللـه] وہ تاریخی دن جس دن ایک قوم کو نجات دی جاتی ہے اور ایک کو ہلاک کیا جاتا ہے۔ اسی کو [خـلـوا مـن قبـلـهـم] سے تعبیر کیا ہے، یعنی یہ کہ یہ لوگ اپنے پیش رؤں کے دن کا انتظار کر رہے ہیں، جس دن معلوم ہو جائے گا کہ کس ساتھ کیا ہوگا۔ میری دعوت کو جو مانتے ہیں وہ کامیاب ہونے والے ہیں یا تم مخالفین جو کہتے ہو کہ ہم اصل دین پر ہیں اور ہم ہی کامیاب ہوں گے، تو دیکھو کون کامیاب ہوتا ہے، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کامیابی ہماری ہوگی۔

(آیت ۱۰۳) نهـلك الـمـكـذبين[ثم ننجي رسلنا] ، [كذلك]، ایسا ہی ہوگا اس میں کوئی شک نہیں۔ حـق ذلك[حقا] و واجب[علينا] ان ننجي[المؤ منين]۔ ہم ان مومنین مکہ کو نجات دیں گے۔

(آیت ۱۰۴) یہ سورہ کا خاتمہ ہے، اس میں مومنین کو ہدایات دی جا رہی ہیں۔

[ياايها الناس] اے مشرکین، اے یہود و نصاریٰ [ان كنتم] تو میں اس کا اثر نہیں قبول کروں گا، توحید ہی پر کاربند رہوں گا۔ جو تم کہتے ہو کہ اس میں کوئی تبدیلی کروں، توحید کا حصہ ہٹا دوں، یا اس میں کوئی اور قسم کی تبدیلی کروں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ہمیشہ اس فاطر السموات والارض کی عبادت کروں گا۔ [امـــرت] خدا کی توحید پر جما رہوں گا۔ اور اس کا بندہ ہوں تو اس کے حکم سے کیسے ہٹ سکتا ہوں [للدين] اطاعت توحید۔ [اقيموا الصلوة] اس لیے کہا جا رہا ہے کہ وہ نماز کو سیدھی نہیں کرتے تھے بلکہ اس میں ٹیڑھ پیدا کرتے تھے یعنی اپنے شرکاء کو شریک ٹھہراتے تھے۔ [حـنيـفا] حال ہے، شرک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ [فان فعلت] اگر تم ایسا کرو گے تو مکذبین جیسا انجام ہوگا۔

(آیت ۱۰۶۔۱۰۷) ایک خدا پر توکل کی دعوت دی جا رہی ہے، اسی کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے، چاہے

وہ ضرر کی شکل میں ہو یا خیر کی شکل میں ہو، وہی صاحب فضل ہے، اس کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی، اس کی نافذ کردہ مصیبت کو کوئی طاقت دور نہیں کر سکتی، جیسا کہ مشرکین مکہ سمجھتے ہیں۔

[هو الغفور الرحيم] وہ اپنے بندہ کو ڈھانپنے والا ہے، مختلف حالات کے باوجود اس دین پر قائم رہو، اس لیے کہ اس کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے۔

(آیت ۱۰۸)[قد جاء الحق] توحید کو کہیں حق کہا جاتا ہے کہیں عدل سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ نبی کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔[من اضل]اس کا وبال اس پر ہے۔[وما انا عليكم بو كيل] ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ میں تمہارے دلوں میں ایمان ڈال دوں، اس لیے کہ تم ایمان کے لیے تیار نہیں، یہ افسوس کا کلمہ ہے جو نبی کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔[يحكم] ایک کو ہلاک کرتا ہے دوسرے کو نجات دیتا ہے، چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر ایک گروہ کو ناکامی دیکھنی پڑھی اور دوسرا گروہ کامیابی کی منزل تک پہنچا، دوسرے نبیوں کے ساتھ جو نجات و ہلاکت کی سنت ادا کی گئی وہ سنت اس نبی رحمت کے ساتھ اپنائی گئی۔ ایسا اس لیے ہوا کہ ان میں ایسے لوگ موجود تھے جو اپنے اندر ایمان کی صلاحیت رکھتے تھے اگر عذاب الٰہی اور قوموں کی طرح آجاتا ہے تو ایک طرح سے ظلم ہوتا، یہی وجہ ہے اس قوم کے لیے کوئی معجزہ نہیں اتارا گیا، معجزہ کی آخری حد یہی ہوتی ہے کہ قوم ہر طرح سے انکار کر بیٹھتی ہے، یہ آخری تنبیہ ہوتی ہے۔ اگر اس کے بعد ایمان نہیں لائے تو ہلاک کر دی جاتی ہے۔

حواشی و تعلیقات

(ا،الف) یونس علیہ السلام (جن کا نام بائبل میں یوناہ ہے اور جن کا زمانہ ۸۶۰۔۷۸۴ قبل مسیح کے درمیان بتایا جاتا ہے، اگرچہ اسرائیلی نبی تھے، مگر ان کو اشور (اسیریا) والوں کے لیے بھیجا گیا تھا اور اسی بنا پر اشوریوں کو یہاں قوم یونس کہا گیا ہے۔ اس قوم کا مرکز اس زمانہ میں نینوی کا مشہور شہر تھا جس کے وسیع کھنڈرات آج تک دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر موجودہ شہر موصل کے عین مقابل پائے جاتے ہیں اور اسی علاقے میں ''یونس نبی'' کے نام سے ایک مقام بھی موجود ہے۔ اس قوم کے عروج کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کا دارالسلطنت نینوی تقریباً ۶۰ میل کی دوری میں پھیلا ہوا تھا۔(تفہیم القرآن جلد دوم سورہ یونس حاشیہ ۹۸)

(ب) سید قطب شہیدؒ نے اس سورہ پر اس طرح طائرانہ نظر ڈالی ہے وہ سورہ یونس اور سورہ ہود کے درمیان موازنہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دونوں سورتیں اپنے موضوع میں بہت ہی مشابہت رکھتی

ہیں اور دونوں یکے بعد دیگرے مذکور ہیں اور ترتیب نزول میں یکساں ہیں۔ مزید وہ مکی سورتوں کی خصوصیات بیان کرتے ہیں کہ ’’مکی دور کے قرآن کے جو عمومی خصائص ہیں ان میں باہم اشتراک ہے، اس طرح کہ انسانی کلام، اپنے موضوع اور ادائیگی بیان میں، کلام ربانی کے کلام سے مشابہ نہیں ہوسکتا، جو کلام الٰہی کے اندر حیرت انگیزیت ہے اور بے مثالیت ہے۔۔ مگر اس کے ساتھ ہی مکی دور کا اپنا خاص مذاق ہے اور اس کا خاص ماحول ہوتا ہے جس سے اس کا بنیادی موضوع متعین ہوتا ہے۔ مختصراً یہ کہ مکی دور میں یہ موضوعات زیر بحث آئے ہیں: الوہیت کی حقیقت، عبودیت کی حقیقت، اور ان کے درمیان تعلقات کی حقیقت، اور لوگوں کے سامنے دین حق کی تفہیم وتشریح پیش کرنا، اور لوگوں کی اس دین کے سامنے سرفگندگی اور دین کو عبادت کا شیوہ بنانا اور اس دین حق کو اپنی شریعت اور حکم تسلیم کرنا۔ اور اس کا موضوع یہ بھی ہے کہ صحیح فطری عقیدہ کے اندر جو گرد وغبار اور جو انحراف اور غلط آمیزش آگئی ہے اس کی تطہیر کرنا، اور لوگوں کو اس دین حق کی طرف واپس بلانا، جس سے ربوبیت اللہ کے تقاضے کے طور پر آخرت کی زندگی منتج ہوتی ہے۔ اسی طرح اس مکی دور میں اس سبجیکٹ کو پیش کرنے کا اسلوب دل پذیر، سحر انگیز، عمیق موسیقیت سے لبریز، رس گھولنے والا (Rhythm) اور ان خصائص کی ادائیگی میں الفاظ کی تعبیر وتشریح میں تمام خصوصیات موجود ہیں جو اپنے تمام موضوعات کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ ’’اس سے پہلے سورہ انعام اور سورہ اعراف بالترتیب آئی ہیں گرچہ ترتیب نزولی میں یکسانیت نہیں ہے پھر انفال وتوبہ کی سورتیں آتی ہیں اور یہ دونوں سورتیں مدنی خصوصیات کے موضوعات اور مزاج اور ماحول کو سمیٹے ہوئے ہیں، اب اس کے بعد سورہ یونس اور سورہ ھود یکے بعد دیگرے آتی ہیں اور ترتیب نزول میں یکے بعد دیگرے نازل ہوئی ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں میں موضوع کے اندر اور موضوع کو پیش کرنے میں بہت زیادہ یکسانیت اور مشابہت ہے، اور اسی طرح سورہ انعام فی نفسہٖ عقیدہ کی حقیقت کے موضوع پر گفتگو کرتی ہے اور اس عقیدہ کا مقابلہ اور کشمکش جاہلی نظریات سے ہوتی ہے اور جاہلی نظریات پر ہر پہلو سے وار کرتی ہے، شعوری عقیدہ اور عملی عبادات کو اجاگر کرتی ہے۔ اسی دوران سورہ اعراف اس عقیدہ اسلامی کی تحریک کو بھرپور طریقے سے پیش کرتی ہے اور تاریخ کے جھروکوں سے جاہلی نظام کی کشمکش اور مقابلہ کے قصوں کو بیان کرتی ہے اسی طرح ہم لوگ سورہ یونس اور سورہ ہود کے اسی قصہ کو دہرا رہے ہیں۔ موضوع کی حیثیت سے بہت ہی مشابہت ہے اور پیش کرنے کے طریقہ واسلوب میں بھی بڑی یکسانیت ہے۔ مگر سورہ انعام سورہ یونس کی موسیقیت

کی عظمت و بلندی اور ضخامت میں منفرد ہےاور دل کی گہرائیوں میں تیز رفتار اور مضبوطی سے اترنے والی ہے اور تصویر کشی اور تحریک پیدا کرنے میں نہایت روشن اور واضح ہےلیکن سورہ یونس پرسکون انداز میں دلوں میں باتوں کو ڈالتی ہے ہم آہنگی اور سلاست سے بھرپور۔لیکن سورہ ہود تو موضوع، ادائیگی، موسیقیت اور اثر اندازی میں سورہ اعراف سے بہت مشابہ ہے۔سید قطب شہیدؒ کا اس طرح سورتوں کا تجزیہ پیش کرنے کا انداز اور اسلوب بہت ہی منفرد ہے۔مکی سورتوں کے مزاج پر گفتگو کرتے ہیں پھر مدنی سورتوں پر بحث کرتے ہیں۔مکی سورتوں میں یکسانیت اور انفرادیت پر گفتگو کرتے ہیں اسی طرح مدنی سورتوں کے بارے میں مشابہت اور انفرادیت پر بحث کرتے ہیں۔

(۲) امام فراہیؒ لکھتے ہیں کہ'' سورہ یونس اور سورہ ھود جڑواں سورہ ہیں۔سورہ یونس میں بعض بستیوں کا ذکر ہےاور سورہ ھود میں بیشتر بستیوں کا ذکر ہے پھر سورہ یوسف میں اس کا ذکر بالخصوص ہوا ہے۔سورہ یونس میں یہ آتیں مومنیں کے لیے بشارت کی ہیں،آیت۲،آیت ۹۔۱۱یت ۲۶،آیت۶۲، آیت۶۴،آیت ۶۵۔اور اسی طرح اس سورہ میں کافرین کو ان آیتوں میں انذار کیا گیا ہے۔آیت ۸، آیت۱۳،آیت،اس سورہ میں دوسری آیتیں ہیں جو مومنین کو دنیا و آخرت میں کامیابی کا مژدہ سنا رہی ہیں(تعلیقات فی تفسیر القرآن،الجزءالاول،ص۲۵۶)

(۳)اس تیسرے گروپ کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:'' اس گروپ کی تمام سورتوں میں مشترک حقیقت، جو مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے واضح فرمائی گئی ہے، یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ کی دعوت سے حق و باطل کے درمیان جو کشمکش برپا ہو چکی ہے وہ بالآخر پیغمبر ﷺ اور اہل ایمان کی کامیابی و فتحمندی اور قریش کی ذلت و ہزیمت پر منتہی ہوگی۔۔دوسرے الفاظ میں یوں کہیےاس میں قریش کے لیے انذار اور پیغمبر ﷺ اور آپ کے صحابہ کے لیے بشارت ہے۔قریش پر عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے دلائل اور تاریخ و نظام کائنات کے شواہد سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جو حق تمہارے پاس آچکا ہے، اگر اس کی مخالفت میں تمہاری یہی روش رہی تو بہت جلد وہ وقت آرہا ہے جب تم اس کا انجام بد اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے۔دنیا میں تم سے پہلے جن قوموں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی ہے، جو حشر ان کا ہوا اور جن کے عبرت انگیز آثار تمہارے اپنے ملک میں موجود ہیں، وہی حشر تمہارا بھی ہونا ہے۔اسی طرح نبی ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کو صبر و استقامت اور تقوی کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ جس حق کو لے کر تم اٹھے ہو انجام کار کی کامیابی اور فیروزمندی اسی کا حصہ ہے۔آفاق و انفس اور تاریخ اقوام و ملل

کے دلائل وشواہد سب تمہارے ہی حق میں ہیں۔ البتہ سنت الٰہی یہ ہے کہ حق کو غلبہ اور کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے آزمائش کے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان مرحلوں سے لازماً تمہیں بھی گزرنا ہے۔ اگر یہ مرحلے تم نے عزیمت واستقامت کے ساتھ طے کر لیے تو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی تمہارا ہی حصہ ہے۔ یثبت الله الذین آمنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا وفی الآخرۃ ویضل الله الظالمین (ابراہیم۔۲۷، تدبر قرآن، جلد۴، ص۱۰)

(۴) مولانا مودودیؒ اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اس تمہیدی فقرے میں ایک لطیف تنبیہ مضمر ہے۔ نادان لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ پیغمبر قرآن کے نام سے جو کلام ان کو سنا رہا ہے وہ محض زبان کی جادوگری ہے، شاعرانہ پرواز تخیل ہے اور کچھ کاہنوں کی طرح عالم بالا کی گفتگو ہے۔ اس پر انہیں متنبہ کیا جارہا ہے، کہ جو کچھ تم گمان کر رہے ہو یہ وہ چیز نہیں ہے۔ یہ تو کتاب حکیم کی آیات ہیں۔ ان کی طرف توجہ نہ کرو گے تو حکمت سے محروم رہ جاؤ گے۔ ایضاً۔ تفہیم القرآن جلد۲ حاشیہ۱

(۴) [قدم صدق] مولانا مودودیؒ اس آیت کی تشریح یوں کرتے ہیں: ''ان کے لیے ان کے رب کے پاس سچی عزت اور سرفرازی ہے''۔ یعنی آخر اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ ان لوگوں کو ہوشیار کرنے کے لیے انسان نہ مقرر کیا جاتا تو کیا فرشتہ یا جن یا حیوان مقرر کیا جاتا۔ اور اگر انسان حقیقت سے غافل ہو کر غلط طریقے سے زندگی بسر کر رہے ہوں تو تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کا خالق و پروردگار انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے یا یہ کہ وہ ان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے انتظام کرے؟ اور اگر خدا کی طرف سے کوئی ہدایت آئے تو عزت وسرفرازی ان کے لیے ہونی چاہیے جو رب کی مان لیں یا ان کے لیے جو اسے رد کر دیں۔ بس تعجب کرنے والوں کو سوچنا تو چاہیے کہ آخر وہ بات کیا ہے جس پر وہ تعجب کر رہے ہیں''۔ تفہیم القرآن جلد۲ حاشیہ۲

(۵) [ان ھذا لساحر مبین]: مولانا مودودیؒ کی تشریح: ''یعنی جادوگر کی پھبتی تو انھوں نے اس پر کس دی مگر یہ سوچا کہ وہ چسپاں بھی ہوئی ہے۔ صرف یہ بات کہ کوئی شخص اعلیٰ درجہ کی خطابت سے کام لے کر دلوں اور دماغوں کو مسحور کر رہا ہے، اس پر یہ الزام عائد کر دینے کے لیے تو کافی نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کی خطابت میں کیا بات ہوتی ہے، کس غرض کے لیے قوت تقریر صرف کر رہا ہے۔ اور جو اثرات اس کی تقریر سے ایمان لانے والوں کی زندگی میں مرتب ہو رہے ہیں وہ کس نوعیت کے ہیں۔ جو خطیب کسی ناجائز غرض کے لیے جادو بیانی کی طاقت استعمال کرتا ہے وہ تو ایک منہ پھٹ، بے لگام اور غیر ذمہ

دار مقرر ہوتا ہے۔ اور اس خطیب کی خطابت سے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ بہت خراب ہوتے ہیں۔ وہ خطابت کی شراب پلا کر لوگوں میں کوئی اخلاقی بلندی پیدا نہیں کرتا۔ مگر یہاں تم دیکھ رہے ہو کہ پیغمبر جو پیش کر رہا ہے اس میں حکمت ہے، ایک متناسب نظامِ فکر ہے، غایت درجے کا اعتدال اور حق صداقت کا سخت التزام ہے۔ لفظ لفظ جچا تلا اور بات بات کانٹے کی تول پوری ہے۔ اس کی خطابت میں تم خلق خدا کی اصلاح کے سوا کسی دوسری غرض کی نشاندہی نہیں کر سکتے'' تفہیم القرآن جلد۲ حاشیہ۳

(۶) [یدبر الامر]: مولانا مودودیؒ کی تشریح: یعنی پیدا کر کے وہ معطل نہیں ہو گیا بلکہ اپنی پیدا کی ہوئی کائنات کے تختِ سلطنت پر وہ خود متمکن ہوا۔ اور سارے جہاں کا انتظام عملاً اسی کے ہاتھ میں ہے۔ نادان لوگ سمجھتے ہیں کہ کائنات کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ دیا ہے کہ خود جس طرح چاہے چلتی رہے، یا دوسرے کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اس میں جیسا چاہیں تصرف کریں۔ قرآن اس کے برعکس یہ حقیقت پیش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی تخلیق کردہ اس پوری کائنات کے گوشے گوشے میں ہر آن جو کچھ ہو رہا ہے براہِ راست اس کے حکم یا اذن سے ہو رہا ہے۔ تفہیم القرآن جلد۲ حاشیہ۴

(۷) [ما من شفیع الا من بعد اذنه]: مولانا مودودی کی تشریح: یعنی دنیا کی تدبیر اور انتظام میں کسی دوسرے کا دخل ہونا تو درکنار کوئی اتنا اختیار بھی نہیں رکھتا کہ خدا سے سفارش کر کے اس کا کوئی فیصلہ بدلوا لے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی جو کچھ کر سکتا ہے وہ بس اتنا کہ خدا سے دعا کرے، مگر اس دعا کا قبول ہونا نہ ہونا خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ کوئی زور ڈال کر نہیں منوا سکتا ہے۔۔ تفہیم القرآن جلد۲ حاشیہ۵)

(۸) [فاعبدوه]: مولانا مودودی کی تشریح: اوپر کے تین فقروں میں حقیقت نفس الامری کا بیان تھا کہ فی الواقع خدا ہی تمہارا رب ہے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس امرِ واقعی کی موجودگی میں تمہارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔۔ تفہیم القرآن جلد۲ حاشیہ۶

(۹) [أفلا تذكرون]: مولانا مودودی کی تشریح: جب حقیقت کھل کر سامنے آ گئی تو تمہاری آنکھیں اب بھی غفلت کے پردے میں ہی رہیں گی؟ تفہیم القرآن جلد۲ حاشیہ۷

(۱۰) [مرجعكم]: مولانا مودودی کی تشریح: یہ نبی کی تعلیم کی دوسری بنیادی چیز ہے۔ پہلی بنیاد یہ بتلائی گئی کہ ایک خدائے واحد کی بندگی کرو۔۔ تفہیم القرآن جلد۲ حاشیہ۸

(۱۱) [یبدؤ الخلق ثم یعیده]: مولانا مودودیؒ کہتے ہیں ''یہ فقرہ دعوے اور دلیل دونوں پر مشتمل ہے۔۔ تفہیم القرآن جلد۲ حاشیہ۹

(۱۳)[و عذاب الیم بما کانوا یکفرون]: مولانا مودودیؒ کی تشریح: ''یہ وہ ضرورت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ انسان کو دوبارہ پیدا کرے گا۔ اور جو دلیل دی گئی وہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی تھی کہ خلق کا اعادہ ممکن ہے اور اسے مستبعد سمجھنا درست نہیں ہے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ اعادۂ خلق عقل وانصاف کی رو سے ضروری ہے۔ اور یہ ضرورت تخلیق ثانیہ کے سوا کسی دوسرے طریقے سے پوری نہیں ہوسکتی۔ خدا کو اپنا واحد رب مان کر جو لوگ صحیح بندگی کا رویہ اختیار کریں وہ اس کے مستحق ہیں کہ انہیں اس بجا طرز عمل کی پوری پوری جزا ملے۔ اور جو لوگ حقیقت سے انکار کر کے اس کے خلاف زندگی بسر کریں وہ بھی اس کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے اس بے جا طرز عمل کا برا نتیجہ دیکھیں۔ یہ ضرورت اگر موجودہ دنیوی زندگی میں پوری نہیں ہو رہی ہے (اور ہر شخص جو ہٹ دھرم نہیں ہے جانتا ہے کہ نہیں ہو رہی ہے) تو اسے پورا کرنے کے لیے یقیناً دوبارہ زندگی ناگزیر ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد۲، حاشیہ۱۰)

(۱۴) سائنسی تحقیق پر تنقید اور قرآن مجید کی فلسفیانہ تحقیق:

مولانا نے قرآن کی روشنی میں فلسفیانہ تحقیق اور سائنس کی تحقیق کے بارے میں ایک اصولی بات کہی ہے کہ اس کائنات کے اندر جو کچھ آثار اور نشانیاں ہیں قرآن ان کے بارے میں غور کرنے کے لیے کہتا ہے اور انبیاء کرام اس پر آفاق وانفس کی دلیلیں دیتے ہیں اور اسی کے مطابق سوچنے کی دعوت دیتے ہیں جس کی بنیاد وہم وگمان نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی عقل وبصریت کی روشنی میں دعوت دی گئی ہے، مولانا اس سلسلہ میں آیت ٦٦ کے تحت حاشیہ ٦۵ میں لکھتے ہیں:

فلسفیانہ تجسس، جس کا مقصد یہ پتہ چلانا ہے کہ اس کائنات میں بظاہر جو کچھ ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اس کے پیچھے کوئی حقیقت پوشیدہ ہے یا نہیں اور ہے تو وہ کیا ہے، دنیا میں ان سب لوگوں کے لیے جو وحی والہام سے براہ راست حقیقت کا علم نہیں پاتے، مذہب کے متعلق رائے قائم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ کوئی شخص بھی خواہ دہریت اختیار کرے یا شرک یا خدا پرستی، بہر حال ایک نہ ایک طرح کا فلفسیانہ تجسس کیے بغیر مذہب کے بارے میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اور پیغمبروں نے جو مذہب پیش کیا اس کی جانچ بھی اگر ہوسکتی ہے کہ آدمی، اپنی بساط بھر، فلسفیانہ غور وفکر کر کے اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرے کہ پیغمبر ہمیں مظاہر کائنات کے پیچھے جس حقیقت کے مستور ہونے کا پتہ دے رہے ہیں وہ دل کو لگتی ہے یا نہیں۔ اس تجسس کے صحیح یا غلط ہونے کا تمام تر انحصار طریق تجسس پر ہے، اس کے غلط ہونے سے غلط رائے اور صحیح ہونے سے صحیح رائے قائم ہوسکتی ہے، اس بعد مولانا نے جائزہ لیا ہے، وہ کہتے ہیں

کہ اشراقیوں اور جوگیوں کی سراغ رسانی کی بنیاد گمان پر ہے اور گمان سے جو خیال قائم کیا ہے اس پر تخیل کو جما دیتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں وہی خیال چلتا پھرتا نظر آتا ہے اور اصطلاحی فلسفیوں کی اپنی تحقیق کی بنیاد گمان ہی ہے لیکن ان کا گمان منطقی استدلال اور مصنوعی تعقل پر ہے جس کا نام قیاس ہے۔

سائنسداں ، سائنس کے دائرے میں تحقیقات کے لیے علمی طریقہ اختیار کرتے ہیں لیکن مابعدالطبیعیات کے حدود میں داخل ہوتے ہیں تو علمی طریقہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور قیاس وگمان اور اندازے اور تخمینے کے پیچھے چل پڑتے ہیں، قرآن اس طریقہ تجسس کو غلط قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم لوگوں کی گمراہی کا اصل سبب یہی ہے کہ تم تلاش حقیقت کی بنا گمان اور قیاس آرائی پر رکھتے ہو اور پھر تعصب کی وجہ سے کسی معقول بات سننے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوتے۔ اسی دوہری غلطی کا نتیجہ یہ ہے کہ تمہارے لیے خود حقیقت کو پالینا ناممکن تھا ہی، انبیاء کے پیش کردہ دین کو جانچ کر صحیح رائے پر پہنچنا بھی غیر ممکن ہو گیا۔ اس کے مقابلہ میں قرآن فلسفیانہ تحقیق کے لیے صحیح علمی وعقلی طریقہ یہ بتاتا ہے کہ پہلے تم حقیقت کے متعلق ان لوگوں کا بیان کھلے کانوں سے، بلاتعصب سنو جو دعوی کرتے ہیں کہ ہم قیاس وگمان یا مراقبہ واستدراج کی بنا پر نہیں علم کی بنا پر تمہیں بتا رہے ہیں کہ حقیقت یہ ہے۔ پھر کائنات میں جو آثار (باصطلاح قرآن ''نشانات'') تمہارے مشاہدے اور تجربے میں آتے ہیں ان پر غور کرو، ان کی شہادتوں کو مرتب کر کے دیکھو، اور تلاش کرتے چلے جاؤ کہ اس ظاہر کے پیچھے جس حقیقت کی نشاندہی یہ لوگ کر رہے ہیں اس کی طرف اشارہ کرنے والی علامت تم کو اسی ظاہر میں ملتی ہیں یا نہیں۔ اگر ایسی علامات نظر آئیں اور ان کے اشارے بھی واضح ہوں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ خواہ مخواہ ان لوگوں کو جھٹلاؤ جن کا بیان آثار کی شہادتوں کے مطابق پایا جا رہا ہے۔ یہی طریقہ فلسفہ اسلام کی بنیاد ہے جسے چھوڑ کر افسوس ہے کہ مسلمان فلاسفہ بھی افلاطون وارسطو کے نقش قدم پر چل پڑے۔ مزید تفصیل کے لیے (تفہیم القرآن سورہ یونس جلد دوم حاشیہ ۶۵)

طلاق، رحمت یا زحمت

خبیب کاظمی،قطر۔ای میل:khfalahi@yahoo.com

قرآن پاک میں طلاق سے متعلق جو آیات وارد ہیں اور شریعت میں طلاق کے جو احکامات موجود ہیں وہ نہایت حکیمانہ اور منصفانہ ضابطے کے تحت ہیں۔یہ قانون لوگوں کو تنگی اور پریشانی میں ڈالنے کے لیے نہیں بلکہ آسانی پیدا کرنے کے لیے ہے۔طلاق کا قانون انسانوں کے لیے زحمت نہیں بلکہ رحمت ہے۔

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، وہ انسان کی فطرت کواپیل کرنے والا دائمی اوراٹل قانون ہے۔اسلام کسی شعبے میں اور کسی مخلوق کے ساتھ ناانصافی اور غیر عادلانہ نظام کو برداشت نہیں کرتا۔اسلام تو وہ مذہب ہے جوانسان کی پیدائش سے قبل ہی سے اس کے حقوق طے کر دیتا ہے۔ان میں حقِ زندگی، حقِ وراثت، وصیت، اورنفقہ جیسے حقوق شامل ہیں۔قربان جایئے نظامِ اسلامی پر جہاں بچوں کے حقوق کی ضمانت ان کی پیدائش سے پہلے ہی فراہم کردی جاتی ہے۔کیا دنیا کے کسی نظام قانون میں اس طرح کے عدل ومساوات کا تصور ہے؟

کیا عقل اس بات کوتسلیم کرسکتی ہے کہ جو مذہب اُس مخلوق کے حقوق کی بات کرتا ہے جس کا ابھی وجود بھی نہیں ہوا تو پھر عورت جس کے وجود سے ہی ساری کائنات کی رونق ہے اس کے حقوق کو کیسے فراموش کرسکتا ہے؟ اسلام میں دیگر افرادِ معاشرہ کی طرح عورتوں کا بھی ایک اخلاقی مقام اور معاشرتی درجہ ہے۔یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جو اخلاقی، قانونی اور برابری کا مقام دیا ہے وہ نہ پہلے کوئی نظام عالم دے سکا ہے اور نہ آئندہ دے سکتا ہے۔

اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں عورت کی کیا حیثیت تھی؟ عورت کو چوپایوں کی طرح خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ وہ اپنے بنیادی حق، حقِ زندگی تک سے محروم تھی۔ بیٹیاں زندہ درگور کردی جاتی تھیں ان کو حق زندگی اسلام نے عطا کیا (التکویر: 8-99) عورت کو بحیثیت انسان سب سے پہلے اسلام نے تسلیم کیا (النساء: 1) اسلام میں نہ مرد کے لیے مردانگی قابلِ فخر ہے اور نہ عورت کے لیے نسوانیت باعث عار ہے۔ (بنی اسرائیل: 70)

محسن انسانیت ﷺ نے اولین روز سے عورت کو ذلت وپستی سے نکال کر عزت وتکریم کا مقام عطا فرمایا۔ عورت اگر ماں ہے تو اس کے پیروں تلے جنت بتلایا، بیٹی ہے تو آنکھوں کی ٹھنڈک نیز آتشِ دوزخ سے بچنے کا وسیلہ۔ اگر وہ بیوی ہے تو دنیا کا سب سے قیمتی خزانہ ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنی بیویوں کے ساتھ بہترین سلوک کرے۔ خیرُکم خیرُکم لاهله وأنا خیرُکم لأهــلــي۔ اسلام نے جب علم کا حصول فرض کیا تو مردوزن دونوں کے لیے دروازے کھلے رکھے۔ بلکہ لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی طرف خاص توجہ دلائی۔ آپ ؐ نے فرمایا: جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی، ان کو تعلیم وتربیت دی، ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے۔ (مَـنْ عَالَ ثلاثَ بناتٍ فأدَّبَهُنَّ وَزَوَّجَهُنَّ وأحسنَ إليهِنَّ فله الجنة-ابوداوٴد)

اسلام روزِ اول سے ہی عورتوں کے حقوق کا امین ومحافظ ہے۔ مذہبی، سماجی، معاشرتی، قانونی، سیاسی اور انتظامی کردار کا نہ صرف اعتراف کرتا ہے بلکہ اس کے جملہ حقوق کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے۔ آج کل ہندوستان میں یکساں سول کوڈ کے بہانے مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کی بھرپور کوشش ہورہی ہے۔ چودہ سو سال سے آرہے شرعی مسائل، جن میں تین طلاق کا مسئلہ بھی شامل ہے، اسے ظلم اور زیادتی کہہ کر شرعی قانون میں مداخلت کی کوشش ہورہی ہے۔ قانونِ طلاق کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہا جارہا ہے کہ اسلام نے عورت کو عزت نہیں دی۔ عورت کو مرد کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ حالانکہ جو لوگ اسلام کے ضابطۂ طلاق کا مذاق اڑاتے ہیں ان کو اپنے یہاں کے قوانین کا بھی جائزہ لے لینا چاہیے۔ ہندو مذھب میں مطلقہ اور بیوہ کے کیا حقوق ہیں؟ ستی جیسی گھناؤنی اور ظالمانہ رسم کہاں اور کس مذہب میں تھی؟ عیسائیوں کے یہاں طلاق کے لیے کیا شرائط ہیں؟ پتہ کیا جائے کہ عیسائیوں کے یہاں طلاق کے بعد عورت دوسری شادی کرسکتی ہے یا نہیں؟ جس سماج میں طلاق کی اجازت نہیں وہ سماج کیسا جہنم بنا ہوا ہے، میاں بیوی کس طرح ایک دوسرے کے لیے عذاب اور گھٹن کا باعث بنے ہوئے ہیں۔

اسلام کی نگاہ میں جس طرح نکاح کا رشتہ باعثِ سکون وتسکین ہے اسی طرح قانونِ طلاق بھی سراسر رحمت ہے۔اس میں عورت کی تذلیل،اس کا استحصال نہیں ہوتا بلکہ اس کے حقوق کی حفاظت ہوتی ہے۔استاذِ محترم مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب اپنے کتابچے ''نکاح وطلاق کا قرآنی نظام'' میں طلاق کے احکام سے متعلق کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''اسلام نے نہ صرف مسلمانوں کو نکاح کی ترغیب دی ہے، بلکہ اس کے سلسلے میں ایسے اصول اور ایسے ضابطے دیے ہیں کہ اگر مسلمان ان کی پابندی کریں، تو اپنی عائلی زندگی میں کبھی الجھنوں کا شکار نہ ہوں۔کبھی خاندانی اختلافات سے دوچار نہ ہوں۔ان کی زندگی نہایت پرمسرت اور خوش گوار زندگی ہو، الفت اور محبت کی زندگی ہو۔اسلام نے نکاح کا یہ نظام بنایا ہی اس اساس پر ہے کہ شوہر کو بیوی سے، اور بیوی کو شوہر سے سکون حاصل ہو، بلکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے سراپا سکون اور ذریعۂ سکون بن جائیں، اور یہ کوئی وقتی کیفیت نہ ہو بلکہ ایک دائمی کیفیت ہو جائے۔وہ ایک دوسرے کے لیے ایسا سکون بن جائیں کہ ایک دوسرے کے بغیر انہیں چین نہ آئے''۔''یہی وجہ ہے کہ نکاح اگر متعین مدت کے لیے یا متعین مدت کی نیت سے ہو، تو وہ اسلام میں جائز نہیں''۔نکاح کے اس مضبوط رشتے کے باوجود اس بات کا احتمال ہوسکتا ہے کہ کبھی رشتوں میں اختلافات پیدا ہو جائیں اور یہ اختلافات نزاعات کی شکل اختیار کرلیں، پھر یہ رشتہ دونوں کے لیے عدم سکون کا باعث بن جائے تو ایسی صورت میں دین اسلام نے نہایت تفصیلی ہدایات ، بہت سخت اصولوں اور کڑی شرائط کے ساتھ اس بات کی اجازت دی ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ دونوں گھٹ گھٹ کر زندگی گزاریں، اپنے لیے دوسرا رفیق حیات چن لیں۔

آیئے طلاق سے متعلق کچھ ضروری اور اہم احکامات کا مطالعہ کیا جائے۔

طلاق کے لغوی اور شرعی معانی :طلاق لغت میں ترک کر دینے، چھوڑ دینے، یا قید و بند کھول دینے کو کہتے ہیں۔اور اصطلاح شریعت میں نکاح سے پیدا ہونے والی حلت اور قید و بندش کو مخصوص الفاظ کے ذریعہ ختم کر دینے کا نام طلاق ہے۔

شرائط :طلاق دیتے وقت ضروری ہے کہ شوہر عاقل، بالغ اور بیدار ہو۔اگر ان میں کوئی بھی شرط نہیں پائی گئی تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔

اصلاحِ حال کی کوشش:اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک طلاق سب سے ناپسندیدہ حلال ہے۔شریعت اس بات کی تلقین کرتی ہے کہ شوہر بہت سمجھ بوجھ کر، انتہائی عفو و درگزر کے ساتھ اپنے

اس حق کا استعمال کرے۔ بیوی کے عیوب پر صبر کرے۔ ناراضگی کے باوجود اس کے ساتھ حسن سلوک کرے۔(النساء:19) یہ طلاق محض وقتی اور ہنگامی ناگواری کی بنا پر نہ دی جائے۔ طلاق سے پہلے معاملات کو سدھارنے اور نبھانے کی بھی بھرپور کوشش کرنے کی ہدایت ہے۔تربیت کی غرض سے بیوی سے علیحدگی اختیار کرنے کا حکم ہے۔ ہلکی پھلکی زجر وتوبیخ کی بھی اجازت ہے، اس کے باوجود اگر معاملات میں سدھار نہیں آپائے تو دونوں کے خاندان والوں میں سے کچھ سمجھدار اور با اثر حضرات کی کمیٹی بنادی جائے جو دونوں کے مسائل کو سمجھ کر آسان اور منصفانہ حل بتا سکیں۔مگر اس کام کے لیے شرط یہ رکھی گئی ہے کہ دونوں خاندانوں کے بزرگوں کو جمع کرنے کا مقصد صرف خانہ پری یا دنیا کو دکھانے کے لیے محض ایک رسم نہ ہو بلکہ نیک نیتی اور اصلاحِ واقعی ہو۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے: اِن أرادَا اِصْلَاحًـا يُوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا (وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا-النساء:35)۔ان ساری کوششوں کے بعد بھی اگر صورتحال درست نہیں ہو رہی تو پھر آخری حل کے طور پر طلاق کا قانون ہے۔

طلاق کا طریقہ: قرآن وحدیث میں طلاق کا جو طریقہ ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ شوہر صرف ایک طلاق اُس پاکی کی حالت میں دے جس میں اس سے ہم بستری نہ کی ہو۔ طلاق کے بعد عورت حالت عدت میں ہو جائے گی۔ایامِ عدت بعض کے نزدیک تین حیض ہیں اور بعض کے نزدیک تین طہر ہیں۔جن کی ماہواری بند ہوگئی ہو ان کی عدت تین ماہ ہوگی۔اور اگر حالت حمل میں طلاق دی ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔طلاق کے بعد شوہر کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنی بیوی کو گھر سے نکال دے۔ عورت عدت کے ایام اپنے شوہر کے گھر پر ویسے ہی گزارے گی جس طرح عام زندگی گزارتی آئی ہے۔ نہ شوہر اسے گھر سے نکال سکتا ہے اور نہ بیوی عدت سے پہلے شوہر کا گھر چھوڑ کر جائے۔البتہ اس عرصہ میں عورت کا بستر شوہر سے الگ رہے گا تا آنکہ اِس بیچ ان دونوں میں میل جول اور صلح صفائی ہو جائے اور شوہر رجوع کر لے۔مگر یہ رجوع کا حق صرف عدت کے اندر ہے، اگر عدت مکمل ہوگئی تو رجوع کا حق باقی نہیں رہے گا۔اگر شوہر عدت کے دوران رجوع کر لے تو اس طلاق کو طلاقِ رجعی کہیں گے، اور رجوع نہ کیا تو طلاق بائن کہلائے گی۔طلاق بائن کے بعد شوہر کے لیے رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے، اب اگر ساتھ رہنا چاہتا ہے تو ازسرِ نو نکاح کرنا ہوگا اور بیوی کو پھر سے مہر دینا ہوگا۔

اگر رجوع کرنے کا ارادہ نہیں ہے تو یہ ایک طلاق دونوں کی علیحدگی اور دونوں کی آزادی کے لیے

کافی ہوگی۔اوراگر رجوع کرلیا، یاعدت گزرنے کے بعد دوبارہ نکاح کرلیا،لیکن اس کے بعد پھر حالات خراب ہوگئے، اور بات نہیں بن پائی تو حیض (مدتِ عدت) ختم ہونے کے بعد پھر سے ایک بار طلاق دے گا، اس دوسری طلاق کے لیےبھی وہی احکامات وہدایات ہوں گی جو پہلی طلاق کے لیے تھیں۔اگر اس دوسری عدت میں شوہر رجوع کرلےتو یہ طلاق بھی رجعی کہلائے گی اور رجوع نہ کیا تو بائن کہلائے گی۔اس طرح گویا دوطلاق واقع ہوجائیں گی۔اب اگر دوسری طلاق بائن کے بعد ساتھ رہنا چاہتا ہےتو پھر سے ایک بار اسی طرح نکاح کرنا پڑے گا جس طرح نکاح اول اور نکاح ثانی کر چکا ہے، بالکل نئے سرے سے گواہ بنانے ہوں گےاور نیا مہر مقرر کرنا ہوگا۔

یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہے کہ وہ دومرتبہ طلاق کا حق لے چکا ہے۔اب ساری زندگی میں صرف ایک بار ہی اس کے لیےطلاق کا یہ حق بچا ہے۔جب بھی وہ تیسری مرتبہ بیوی کوطلاق دے گا تو وہ بائن ہی ہوگی۔اب شوہر کو رجوع کرنے یا دوبارہ نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔اسی بات کوقرآن نے ’’الطلاق مرتان‘‘ سےتعبیر کیا ہے،یعنی طلاق دو ہی مرتبہ ہےاور دونوں مرتبہ کی طلاقوں میں یہ لچک رکھ دی کہ ان سے نکاح بالکل ختم نہیں ہوا۔اگر شوہر چاہےتو شرعی قاعدے کےمطابق رجعت کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں رکھ لے یا پھرخوب صورتی اورخوش معاملگی کے ساتھ اس کوچھوڑ دے۔اسی کوقرآن نے’’ فامساك بمعروف ‘‘اور’’ تسریح باحسان ‘‘کہا ہے، کہ دوطلاق کے بعد یاتو دستور کےمطابق رجوع کرلو یا بھلےطریقے سے چھوڑ دو۔یہ ہیں طلاق کےآداب اورطریقے جوہمیں قرآن وحدیث میں ملتے ہیں۔اگر یہ آداب ملحوظ رکھے جائیں تو طلاق کی شرح کم سے کم ہوجائے گی۔بات یہیں پرختم نہیں ہوئی۔آج جودشمنانِ دین اور کچھ مغرب زدہ مسلمان،عورتوں کےحقوق کی آڑ میں اسلام پرتنقید کرتے ہیں ان کے لیے یہ بات بھی بتادوں کہ طلاق کے بعد بھی شوہر کوکیا کیا ہدایات ہیں۔

علیحدگی ہمدردی اورغمخواری کے ماحول میں ہو، نہ کہ نفرت اور بیزاری کے ماحول میں (تسریح باحسان)

جب عورت کو رخصت کیا جائے تو کچھ تحفے تحائف، کچھ کپڑے اور کچھ روپے پیسے کے ساتھ باعزت طریقے سے رخصت کیا جائے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِلمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالمَعرُوفِ حَقًّا عَلَى المُتَّقِينَ (طلاق یافتہ عورتوں کودستور کےمطابق کچھ ضروری سامان دیئے جائیں یہ واجب ہے ان لوگوں پر جواللہ سے ڈرتے ہیں)۔

قرآن کی یہ بھی ہدایت ہے کہ طلاق سے پہلے جو کچھ اس کو دیا ہے چاہے وہ مال کا ڈھیر ہی کیوں نہ ہو اسے واپس لینے کی اجازت شوہر کو قطعی نہیں ہے۔ و آتیتم احداھن قنطارا فلا تاخذوا منه شیئا (اور اگر تم نے ان میں سے کسی کو ڈھیروں مال دیا ہے تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو)۔ اس کے برعکس اگر شوہر کے ذمہ مہر یا اس کا کچھ حصہ باقی رہ گیا ہو تو وہ ادا کرے۔ اگر عورت کا کوئی قرض اس کے ذمہ ہے، کوئی زیور یا کوئی سامان اس نے لیا ہے تو وہ واپس کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے۔

اگر عورت کی گود میں بچہ ہے تو اس کی پرورش اور کفالت کی ساری ذمہ داری بھی مرد پر عائد ہوتی ہے۔ (وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ)۔

قرآن پاک میں طلاق سے متعلق جو آیات وارد ہیں اور شریعت میں طلاق کے جو احکامات موجود ہیں وہ نہایت حکیمانہ اور منصفانہ ضابطے کے تحت ہیں۔ یہ قانون لوگوں کو تنگی اور پریشانی میں ڈالنے کے لیے نہیں بلکہ آسانی پیدا کرنے کے لیے ہے۔ طلاق کا قانون انسانوں کے لیے زحمت نہیں بلکہ رحمت ہے۔ اس بات کا قوی امکان اور اندیشہ ہے کہ اگر ایک کم علم اور کم فہم شخص عورتوں کے ان حقوق کا مطالعہ کرلے تو وہ یہ نہ کہنے لگ جائے کہ اسلام میں عورتوں کے حقوق زیادہ ہیں مردوں کے نہیں اور خدانخواستہ یہ نہ کہا جانے لگے کہ طلاق اور نکاح کے معاملہ میں مردوں کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔ (سکونِ دل پانے کا کارگر نسخہ)

اللہ تعالیٰ ہمیں احکام الٰہی کے مطابق چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

محمد مارماڈیوک پکتھال کے تہذیبی افکار

ضمیر الحسن خاں فلاحی،علی گڑھ،موبائیل نمبر:07417449612

مغرب اوراسلام یااسلام اورمغرب عصرجدیدکاحساس موضوع ہےاس حوالہ سےاسلام کے موقف کوپیش کرنے کی غرض سے بہت کچھ لکھا گیامگر جوبات مغرب کے اپنے فرزندان کےقلم وزبان میں ہوسکتی ہےوہ کسی دوسرے کے بیان میں شاید نہ ملے۔محمد مارماڈیوک پکتھال بھی ایسے ہی فرد تھے۔وہ ایک کامیاب مترجم قرآن ،مفکراسلام،محقق ،صحافی اورمبلغ تھے ۔پکتھال ان شخصیات میں سے ہیں جو زمین وآسمان کی ہزاروں گردشوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں اورصدیوں کومتاثر کرتی ہیں۔ وہ غیرمعمولی صلاحیتوں کے مالک نابغہ انسان تھے جوگرچہ گھٹاٹوپ اندھیروں میں پیداہوئےمگران کی عقل سلیم انہیں اسلام کی سیدھی اورروشن شاہ راہ پرلےآئی۔

محمد مارماڈیوک پکتھال ۷/اپریل ۱۸۷۵ءکو برطانیہ کےایک گاؤں میں مقامی گرجا گھر میں پیدا ہوئے(Ur. M. Wikipedia.org.)حصول علم کے لیے پکتھال نے متعددممالک کا سفرکیا، وہاں کی تہذیب وثقافت کوبچشم خوددیکھا۔اس حوالہ سےانہیں مصر میں رہ کر وہاں کی تہذیب وثقافت کے مطالعہ ومشاہدہ کا بھی موقع ملانیزکئی ماہ ترکی میں بھی رہے۔اپنے قیام ترکی کے دوران پکتھال نے قبول اسلام کامصمم ارادہ کرلیالیکن غازی طلعت کے مشورہ کے مطابق لندن جاکر دسمبر۱۹۱۴ء میں اپنے قبول اسلام کاباقاعدہ اعلان کیا۔اس اعلان سےلندن کی علمی وسیاسی دنیامیں ہلچل مچ گئی۔عیسائی دنیا کاتبصرہ تھا:''جس مذہب کو پکتھال جیسا شخص قبول کرتا ہے یقیناً اس میں بہت سی خوبیاں ہوں گی''(محمد مارماڈیوک،اسلامی ثقافت اوردورجدید۔اردوترجمہ،توراکینہ قاضی،ص۱۷،اریب پبلی کیشنز دہلی)

قبول اسلام کےموقع پرپکتھال کے جوتأثرات تھےوہ ہم جیسے روایتی وموروثی مسلمانوں کے لیے انتہائی چشم کشااورقابل عبرت ہیں۔ان کا تأثر تھا:''میں اپنے زورمطالعہ سےمسلمان ہواہوں،اس لیے میرے دل میں اس کی بے حدقدر ہے۔مسلمانوں کواسلام ورثہ میں ملا ہےاس لیے وہ اس کی قدرنہیں

جانتے۔حقیقت یہ ہے کہ اسلام امن وعافیت کا گہوارہ ہے اور اس نعمت پر میں خدائے بزرگ وبرتر کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے'' ۔(محمد مارماڈیوک، اسلامی ثقافت اور دور جدید۔اردو ترجمہ،تورا کینہ قاضی ،ص ۱۷)

پکتھال نے اپنی پوری زندگی اسلام کی خدمت میں لگائی، حیات مستعار کا ایک ایک لمحہ دین حق کی اشاعت میں صرف کرتے ہوئے دنیا کا یہ عظیم الشان انسان، عالم باعمل، جلیل القدر مفکر ومصنف ۱۹ر مئی ۱۹۳۶ءکو اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے بھی بڑے انوکھے ہوتے ہیں۔ جہاں مسلمانوں کو اپنے دین کی خدمت کی توفیق یا اس کی سربلندی کی فکر نہیں ہوتی وہاں مارماڈیوک پکتھال جیسے لوگ مسلمان بن کر اسلام کی وہ خدمت کر جاتے ہیں کہ ان کے کارنامے تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔سطور ذیل میں پکتھال کے تہذیبی افکار کا مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

محمد مارماڈیوک پکتھال کے مطابق تہذیب سے مراد انسانی دل ودماغ کی آراستگی وآرائش ہے۔ اس کا مقصد ایک فرد یا کسی مخصوص قوم کی نہیں بلکہ تمام بنی نوع انساں کی آراستگی ہے۔اگر کسی ملک میں ظلم وناانصافی کا بازار گرم ہے اور تعصب وعدم مساوات کی لعنتیں اس پر مسلط ہیں، اس ملک میں فنون وہنرمندی کے بہترین اور اعلیٰ شاہکاروں کی بہتات وفراوانی اس کے لیے ہرگز باعث افتخار نہیں ہوسکتی۔(ایضاص ۲۵)

تہذیب کی عمومی تعریف کرنے کے بعد وہ اسلامی تہذیب کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہیں کہ تہذیب اسلامی کا منشا زندگی کے غیر اہم اور رسمی لوازمات کی تربیت نہیں بلکہ نفس زندگی کی تزئین وآراستگی ہے۔(ایضاً ص ۲۶)

وہ مزید لکھتے ہیں: اسلامی تہذیب سے میری مراد کوئی ایسی تہذیب نہیں ہے جو مسلمان کو کسی بیرونی مأخذ سے حاصل ہوئی ہو۔ بلکہ اسلامی تہذیب سے مراد اسلام یعنی اس مذہب کی تعیین کردہ تہذیب ہے جس کا واضح مقصد انسانی ترقی ہے۔(ایضاً ص ۲۶)

معترضین، اسلام پر ایک اعتراض یہ بھی کرتے ہیں کہ وہ بت شکن، قدیم رسوم وعقائد کا دشمن اور فنون لطیفہ کا سخت مخالف ہے۔لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔اسلام فی نفسہ فن کا مخالف نہیں ہے، حسن وجمال، خواہ قدرتی ہو یا مصنوعی، اس کی اساس کم وبیش ہر انسانی فطرت میں ہے۔اسلام اس فطری آرزو کا گلا نہیں گھونٹتا بلکہ اسے کج روی سے روک کر صحیح راستوں پر لگاتا ہے۔اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ فنی کاوش کا مقصد وحید اپنے عقیدہ وتہذیب اور نظام حیات کی نشر واشاعت ہونا چاہیے۔

مغربی ذہن جس چیز کو نادر روزگار اور فنی کاوش قرار دے کر نگاہ احترام سے دیکھتا ہے وہ درحقیقت مادہ پرستی اور تاریک خیالی ہے جسے حواس کی تسکین کی خاطر نہایت لطیف انداز میں بنا کر اور بیش بہا جامہ پہنا کر پیش کیا گیا ہے، یہ اصل میں بت پرستی ہے، جس سے اسلام روکتا اور جس کی مذمت کرتا ہے۔ پکتھال نے اس حقیقت کو یا اسلام اور مغربی ثقافت کے بنیادی فرق کو بڑے لطیف پیرایہ میں سمجھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''ایک زمانہ میں برطانیہ دنیا کا مہذب ترین ملک سمجھا تا تھا (آج بھی ہے) وہاں کے اخباروں میں ایک معمہ دیا گیا جسے حل کرنا تھا۔ فرض کیجئے کہ ایک کمرہ میں یونانی صناعی کا ایک نادر و بے مثال مجسمہ رکھا ہے۔ اسی کمرہ میں ایک بچہ سو رہا ہے۔ اگر اس کمرہ میں آگ لگ جاتی ہے اور ان دونوں میں سے صرف ایک کو بچایا جاسکتا ہے۔ تو آپ کی رائے میں کسے بچانا چاہیے؟ اخبارات کے قارئین کی اکثریت نے جن میں اکثر صاحب فہم وادراک، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگ تھے، جواب دیا: ''بچے کو بے شک جل جانے دیا جائے لیکن مجسمہ کو بچالیا جائے''۔ اس ظالمانہ اور خودغرضانہ فیصلہ کی تاویل یہ کی گئی کہ بچے تو ہر روز ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہوتے ہیں لیکن یونانی صناعی کے ایسے بے بدل نایاب مجسمے دنیا کو دوبارہ حاصل نہیں ہوسکتے۔ مسلمان ایسی کسی بے رحمی اور ناانصافی کے بارے میں سوچنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا۔ اس قسم کی باتوں کو عہد حاضر کی مہذب بت پرستی ہی کہا جاسکتا ہے''۔ (ایضاً ص ۲۷)

جبکہ اسلامی تہذیب کے بارے میں فاضل اسکالر کا خیال ہے کہ وہ ترقی کی راہوں کو ایسے اصولوں کا پابند بناتی ہے جو انسان کی معمول کی زندگی کے ہر پہلو، سیاسی ومعاشرتی اور اس کے دل ودماغ اور روح کے ہر جذبہ پر غالب ہیں۔ اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے مذہب کو اس کے حقیقی میدان عمل یعنی معمول کی زندگی سے متعارف کرایا۔ اس نے واضح کیا کہ مذہب کے پیش نظر آئندہ زندگی کا کوئی دور افتادہ مقصد نہیں ہے اس کا مقصد تو اس دنیا میں اور اس وقت بنی نوع انسان کی خدمت ہے۔ (ایضاً ص ۳۴)

آج کل اسلامی تہذیب کو تنقید کا ہدف بنانے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ وہ موجودہ عہد کے ناکام اصولوں پر مبنی ہونے کے بجائے خالص اللہ کی وحدانیت پر مبنی ہے۔ اسلامی تہذیب کی یہ وہ بنیادی خوبی ہے جو ایک زندہ اور قابل عمل قانون کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی بنیاد پر تاریخ عالم میں انتہائی کامیابی کے ساتھ زیر عمل رہ چکی ہے۔

محمد مارماڈیوک پکتھال نے جدید یا مغربی تہذیب کی ان خامیوں اور کمزوریوں کی بھی نشاندہی کی

ہے جو اسے جارحیت اور ناانصافی پر آمادہ کرتی ہیں اور اس کے اندر سے انسانی اخوت ومروت کو ختم کر دیتی ہیں۔ان میں سے پہلی چیز ان کے نزدیک سود ہے۔سود کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: ’’سود اجتماعی مفادات کے لیے پیغام ہلاکت اور جذبۂ اخوت واخلاص کے لیے پیام مرگ ہے۔اپنے کسی بھائی کی مجبوری پر اپنی ترقی کی بنیادیں استوار کرنا،اخلاقیات کی دنیا میں حد درجہ سفلہ پن شمار ہوتا ہے۔

دولت کا سمٹتے جانا،اسے انتہائی کنجوسی سے جمع کرنا اور کرتے ہی چلے جانا اور خزانہ کے سانپ کی طرح اس پر بیٹھ جانا بنی نوع انسانی پر ایک بڑے ظلم سے کم نہیں ہے۔اس لیے جو معاشرہ سود کی اس لعنت سے پاک نہ ہو وہ کبھی بھی ترقی نہیں کرسکتا۔سود سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی بنیاد ہونے کے ساتھ ساتھ تمام معاشرتی برائیوں، بگاڑ،مظالم اور ناانصافیوں کی جڑ بھی ہے۔‘‘(ایضاً ص ۴۷)یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ارشاد باری تعالی ہے: ’’یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات واللہ لا یحب کل کفار اثیم‘‘(البقرۃ۔۲۷۶)ترجمہ:اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بار آور بناتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہ گار کو پسند نہیں کرتا۔)

اسی طرح کی ایک برائی دولت کا حصول اور مصرف ہے۔مے خواری ایک معاشرتی گناہ اور جوا ایک کارِ بد ہے۔اس سے معاشرہ میں حصول دولت اور مصرف دولت کا ایک آزادانہ ماحول پروان چڑھتا ہے اور انسان کے اندر یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ دولت کا حصول وصرف فرد کا ذاتی اختیار ہے وہ جیسے چاہے اسے حاصل اور جہاں چاہے اسے صرف کرسکتا ہے۔ظاہر ہے جو معاشرہ یہ نظریہ رکھتا ہو وہاں ترقی وخوشحالی کا کیا سوال؟ اسلام اس آزاد و بے لگام نظریہ کی مذمت کرتا ہے اور دولت کو اللہ کی بخشش وامانت قرار دیتا ہے۔

پکتھال کے مطابق ’’قومیت (Nationalism) ایک جارحانہ اور نوع انسانی کی ہلاکت کا موجب تصور ہے،اس نظریہ کی بنیاد پر انسانوں اور انسانوں میں فرق وامتیازات کی دیواریں حائل ہوکر پوری انسانیت کو نقصان سے دوچار کرتی ہیں۔اس لیے اس تصور کو ختم کرنا،رنگ ونسل کے امتیازات کو نابود کرنا ہر انسانی معاشرے اور ہر تہذیب کی ضرورت ہے۔(ایضاً ص ۷۶)

تہذیب حاضر کی ایک بڑی کمزوری اس کا غیر عادلانہ معاشی نظام ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کسی معاشرہ کا معاشی نظام ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔پکتھال کے الفاظ میں ’’کسی اجتماعیت کی تعمیر یا مائل بہ تنزل معاشرہ میں حیات تازہ پیدا کرنے کا سب سے آسان،مؤثر اور تیر بہ ہدف نسخہ اس کے

معاشی نظام کی اصلاح ہے۔'' (ایضاً ص ۷۷) اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ حکمراں طبقہ و جماعت اپنی ذات اور ریاست کے لیے غیر ضروری منافع اندوزی کرنے کے بجائے عوامی فلاح و بہبود یعنی عوام کی خوشحالی اور بہتری کے لیے استعمال کرے۔ دولت کا مقصد بچت نہیں بلکہ دوسرے بھائیوں کو اس سے فائدہ پہنچانا ہے تاکہ مستحق لوگوں کی حوصلہ افزائی ہو اور انسانی برادری کا احساس پیدا ہو۔

پکتھال نے اسلامی اور مغربی تہذیب کا تنقیدی مطالعہ و موازنہ کیا اور پھر دونوں کے درمیان تطابق پر بھی مدلل گفتگو کی ہے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ غالب چیز کے اثرات جلدی قبول کر لیے جاتے ہیں چنانچہ تہذیب جدید کی چکا چوند نے مسلمان ذہنوں کو بھی متاثر کیا ہے اور اس حوالہ سے ان کے دو رویے ہیں۔ وہ یا تو اس سے مرعوب ہو کر اسے اختیار کرنے کے حیلے تلاش کرتے ہیں اور اپنی تہذیب سے فرار چاہتے ہیں یا اس سے گریزاں نظر آتے ہیں اور اس سے دور رہنے ہی میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔ مگر پکتھال کی نظر میں یہ دونوں رویے اس کے مقام و مرتبے سے فروتر ہیں۔ زندگی کے میدان میں کنارہ کشی اختیار کر جانے کا مسلمانوں کے پاس کوئی جواز نہیں ہے بلکہ ان پر لازم ہے کہ وہ نامساعد حالات میں میدان عمل میں آئیں اور مسائل حاضرہ سے ربط و تعلق پیدا کرنے کی پیہم سعی کریں۔

اگر موجودہ تہذیب کی بنیاد سودی نظام پر ہے تو ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کی ضرورت ہے جس میں سود کا نام و نشان نہ ہو۔ اگر ان کی نگاہ میں موجودہ بنک کاری سود پر مبنی ہے تو انھیں اسلامی بنک کاری کا غیر سودی نظام قائم کر کے دکھانا چاہیے۔ اگر موجودہ صنعتی نظام ان کے نزدیک خود غرضانہ اور ظالمانہ ہے تو انہیں ایک جداگانہ صنعتی نظام سے دنیا کو متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔ غرض یہ کہ موجودہ تہذیب میں ان کا ضم ہو جانا سراسر خودکشی کے مترادف ہے لیکن اس تہذیب کو یکسر نظر انداز کر دینے کی اور اس کے اثرات سے بیگانگی کی پالیسی بھی کسی طور خودکشی سے کم نہیں ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ نیکی اور بدی میں امتیاز کریں، اچھائی کو قبول کریں اور برائی کی بیخ کنی کے لیے ہر دم تیار رہیں۔

انسانیت آج ہلاکت کے دہانے پر کھڑی ہے اور مسلمان ہی اسے اس بھیانک انجام سے بچا سکتے ہیں کیونکہ تہذیب کا اصل معیار صرف ان کے پاس ہے اور صرف وہی ایک متبادل تہذیبی نظام دنیا کو دے سکنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ مسلمان اپنے شاندار ماضی کی یادوں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اسلامی تہذیب ہی وہ تہذیب ہے جو ہر عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور مستقبل میں کامیابی کی ضامن ہے۔ (اسلامی ثقافت اور دور جدید ص ۴۹-۱۴۸)

تحریک اسلامی ہند کا نیر اعظم

مولانا ابواللیث اصلاحیؒ

ابو سعد فلاحی، ریسرچ اسکالر، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

موبائیل نمبر:09793189414

اعظم گڑھ سے ۲۳ رکلومیٹر کے فاصلے پر شمال کی جانب ایک گاؤں چاند پٹی تحصیل سگڑی اپنے جن سپوتوں کی بدولت شہرت و نیک نامی کے بام عروج پر پہنچا ان میں سے ایک نمایاں نام مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی کا ہے جو ایک منکسر المزاج اور باوقار علمی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ مربیانہ اور قائدانہ صفات کے مالک تھے، اور جنہوں نے ہندوپاک کی تقسیم کے بعد پیش آنے والے سخت سے سخت اور مشکل سے مشکل حالات میں جماعت اسلامی کے قافلے کو آگے بڑھایا اور مختلف حلقوں میں تحریک اسلامی کی کامیابی اور دین وملت کی خوشحالی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔

مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ۱۵/فروری ۱۹۱۳ء کو چاند پٹی میں پیدا ہوئے، چونکہ عربی میں چاند کو ہلال کہتے ہیں اس لیے یہاں کے اکثر وبیشتر لوگ اپنے نام کے ساتھ ہلالی لکھتے ہیں، مگر مولانا نے ہلالی لکھنے کے بجائے اصلاحی اور ندوی لکھنے کو زیادہ موزوں سمجھا، کیونکہ اصلاح اور ندوہ ہی نے انہیں علم دین جیسی نعمت سے نواز کر دنیا کے سامنے عملی نمونہ بنا کر پیش کیا۔

مولانا کے بچپن کا نام ''شیر محمد'' تھا مگر بعد میں مولانا ابواللیث کے نام سے معروف ومشہور ہوئے، چونکہ مولانا نے علامہ سلیمان ندوی کے مشورہ اور اس نام کی تعریف کرنے پر اس کے علاوہ بالخصوص مولانا امین احسن اصلاحی کی تجویز پر ''شیر محمد'' سے بدل کر اپنا نام ابواللیث رکھا، اس سلسلے میں مولانا عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب نے مولانا کی ایک ملاقات کے حوالہ سے بتایا کہ:

''مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ العالی جو کہ مولانا مرحوم کے استاذ بھی ہوتے تھے انہوں نے ان

سے فرمایا کہ تم اپنا نام بدل لو، مولانا مرحوم نے دریافت کیا کہ متبادل نام کیا ہوسکتا ہے، مولانا امین احسن اصلاحی نے کہا کہ ابواللیث، لیکن مولانا مرحوم کو جیسے یہ نام پسند نہ آیا ہو، البتہ ایک بار سید سلیمان ندویؒ نے اپنی کسی مجلس میں مولانا مرحوم کو نام تبدیل کر لینے کا مشورہ دیا، مولانا مرحوم نے ان سے بھی دریافت کیا کہ کوئی نام بتائیں، انہوں نے کہا کہ سوچ کر بتاؤں گا۔ پھر مولانا مرحوم نے خود ہی تذکرہ کیا کہ استاذ محترم مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی بھی یہی خواہش ہے کہ میں اپنا نام تبدیل کرلوں، اس پر سید صاحب نے پوچھا کہ انہوں نے کوئی اور نام بتایا؟ مولانا مرحوم نے کہا کہ انہوں نے ''ابواللیث'' پسند کیا، سید صاحب خوش ہوگئے، ان کو یہ نام بہت پسند آیا، کیونکہ یہ اسی نام کا خوبصورت ترجمہ تھا، اور کہا کہ یہ نام بہت عمدہ ہے، بالآخر مولانا مرحوم کو شرح صدر ہوگیا اور اسی وقت نام تبدیل کرلیا اور ابواللیث لکھنے لگے''۔

مولانا کے والد ماجد کا نام توجہ حسین تھا، جن کا آبائی پیشہ کھیتی باڑی تھا اور گھرانہ زمیندار تھا، ان کا شمار گاؤں کے باعزت و باوقار لوگوں میں ہوتا تھا، اور اہل علم حضرات سے ان کو خاص عقیدت و محبت تھی، گویا ان کا گھرانہ عزت دار اور مذہبی تھا، اسی عزت دار گھرانے اور مذہبی ماحول میں مولانا کی پرورش و پرداخت ہوئی، یہی وجہ ہے کہ مولانا سیرت و کردار کے غازی کہلائے اور آسمان کی بلندیوں پر آفتاب و ماہتاب کی طرح روشن و تابناک نظر آئے، جن کی ضیا پاشیوں سے بہت سے جید علماء نے فیض حاصل کیا اور انہیں اپنی زندگی کے لیے آئیڈیل بنایا، بعد میں اسی گھرانے میں ایک جید عالم، فقیہ، محدث، محقق، مدبر اور ایک بڑے عالم دین کی حیثیت سے جناب مولانا عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب معروف ومشہور ہوئے، مولانا اپنی خداداد صلاحیتوں اور فطری ذکاوذہانت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں، اس کی روشن اور واضح دلیل ان کی معروف کتابیں ''محمد عربی، حقیقت رجم، اور المیزان'' ہیں جنہوں نے ان کی شہرت و نیک نامی کو بام عروج پر پہنچانے میں نمایاں رول ادا کیا۔

مولانا ابواللیث صاحب نے ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے آبائی وطن موضع چاند پٹی سے کیا اور اس کے بعد محمد آباد گوہنہ سے ثانوی درجے کی تعلیم مکمل کر کے تقریباً چودہ سال کی عمر میں ۶/اگست ۱۹۲۵ء کو مزید تعلیم کے حصول کے لیے مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں داخل ہوئے، وہاں سے عربی پنجم کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۳ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا، ان دونوں اداروں نے مولانا کی ذہنی وفکری صلاحیتوں کو زیور علم سے آراستہ کرنے، سنوارنے، نکھارنے اور پختہ کرنے میں نمایاں رول ادا کیا اور مولانا یہاں رہ کر جن علماء اور اساتذۂ کرام سے فیض یاب ہوئے، ان میں سر

فہرست مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا تقی الدین ہلالی المراکشی اور مولانا مناظر احسن گیلانی وغیرہ شامل ہیں، مولانا کو قرآنیات سے خاص شغف تھا اور انہوں نے قرآن فہمی کو اپنے مطالعہ کا خاص موضوع بنایا، جس میں اچھی استعداد پیدا کرنے کی غرض سے نالندہ صوبہ بہار تشریف لے گئے، اور وہاں پر مولانا مناظر احسن گیلانی کی صحبت میں چھ ماہ رہ کر قرآن فہمی پر عبور حاصل کیا۔

مولانا نہایت ہی ذہین وفطین اور بڑی خوبیوں کے مالک تھے، وہ ایک اچھے طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے خطیب، مقرر، معلم اور کامیاب مربی بھی تھے، اس کے علاوہ جماعت اسلامی ہند کے روح رواں، قائد، رہنما اور ایک عظیم مفکر ومبلغ ہونے کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے بہرہ مند بھی تھے، کتب دینیہ اور قرآن فہمی پر ان کو کامل دسترس حاصل تھی، مولانا کا مزاج جہاں دینی وتحریکی تھا وہیں ان کی متانت، دیانت، راست بازی، زود حسی اور معاملہ فہمی اپنی مثال آپ تھی، اسی حس کی وجہ سے مولانا ہر معاملہ کی تہہ تک آسانی سے پہنچ جاتے تھے، ان کے یہاں اشتعال انگیزی اور مبالغہ آرائی کا ذرہ برابر بھی شائبہ نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ مولانا دوسروں کو اعتدال پسندی کی طرف مائل کرتے رہتے تھے، اور خود بھی معتدل ومتوازن الذہن تھے اور ان کا یہ ذہنی وفکری توازن مختلف مسالک مثلاً: حنفی، شافعی، مالکی وغیرہ سے جڑا ہوا تھا اور متعدد اساتذۂ کرام بالخصوص مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا تقی الدین ہلالی المراکشی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی صحبتِ فیض کا نتیجہ تھا۔

دوارانِ تعلیم مولانا اپنی محنت، ذہانت اور خداداد صلاحیتوں کی بدولت اپنے ان تمام اساتذہ کے بہت ہی چہیتے اور محبوب تھے، اس لیے کبھی بھی اپنے اساتذہ کے خلاف کچھ بھی سننے کے روادار نہ تھے، ایک مرتبہ کسی شخص نے علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں شائع کیں تو مولانا غصے سے بے قابو ہو گئے اور بڑے ہی نظم وضبط اور صبر وشکر کے ساتھ رات دن کی فکر کے بعد اس کا مدلل جواب لکھ کر اپنی شاگردی کا حق ادا کیا۔۱۹۳۳ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ ہونے کے تقریباً ایک سال بعد بحیثیت استاذ مولانا کا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تقرر ہوا، ان کا طریقۂ تدریس انتہائی عالمانہ اور محققانہ تھا اور استدلال اس قدر مضبوط، حقائق پر مبنی، عقل کی تسکین کا سامان، روحِ وجدان کو جھنجھوڑنے اور سوزِ نہاں میں ڈوب جانے والا ہوتا تھا کہ ہر صاحب علم وفراست کو اسے تسلیم کرنے میں ذرہ برابر بھی تأمل نہ ہوتا تھا۔

مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی علامہ شبلی نعمانیؒ، علامہ حمید الدین فراہی اور مولانا مودودیؒ سے

بے حد متأثر تھے۔ ایک بار علامہ شبلی اور علامہ فراہی کے خلاف تکفیر کا ہنگامہ برپا ہوا تو مولانا بہت زیادہ بے چین ہو گئے اور بڑے غور وخوض کے بعد اس کا مدلل جواب لکھ کر شبلی اور فراہی کو کفریہ کلمات کے چھینٹے سے بچا لیا۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے بجنور کے مشہور اور قومی اخبار ''مدینہ'' کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شرکت کر کے اعلیٰ اور معیاری صحافت کا نمونہ پیش کیا۔ مولانا کا شمار مدرستہ الاصلاح سرائے میر سے مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں نکلنے والے رسالہ ''الاصلاح'' کے خاص مضمون نگاروں میں ہوتا تھا۔ چونکہ مولانا ایک عظیم اسلامی مفکر، داعی الی اللہ اور قرآن وحدیث پر گہری نظر رکھنے والے مبصر ومبلغ تھے، ان کی نگاہ قرآن وحدیث اور دین اسلام کے فہم وتدبر میں زیادہ نکتہ رس اور ان کا زورِ قلم زیادہ توانا وطاقتور اور اسلوبِ بیان فکر میں ڈوبا ہوا شستہ اور رواں تھا، مولانا دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم سے بھی واقف تھے اور اپنی محنت وذہانت کی بدولت انگریزی زبان میں اچھی مہارت بھی پیدا کر لی تھی۔ ان کے تعلقات تقریباً ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں کے ساتھ یکساں اور اچھے تھے یہی وجہ ہے کہ علمائے دین کی محفل ہو یا جدید تعلیم یافتہ اصحاب کی مجلس ہر جگہ پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ خطاب کرتے اور اہلِ مجلس کو مستفید فرماتے تھے۔

صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو مولانا مصنف نہ تھے مگر ان میں ایک اچھے مصنف کی ساری خوبیاں موجود تھیں، اس کا صحیح اندازہ مختلف مواقع پر ان کے دیئے گئے درس قرآن، خطاب، تقریر وتحریر اور اعلیٰ ومعیاری مضامین سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی بیشتر تحریریں ملکی اور غیر ملکی حالات پر کتابچے کی شکل میں موجود ہیں۔ جس کے بارے میں رفیق منزل کے ایڈیٹر اپنے اداریہ میں لکھتے ہیں:

''مولانا اس معنی میں مصنف نہ تھے کہ انہوں نے اپنے پیچھے کتابوں کا انبار چھوڑا ہو لیکن اگر مولانا کو موقع ملتا تو ایک اچھے مصنف بن سکتے تھے، اس کا صحیح اندازہ ان کی تحریروں اور مضامین سے ہوتا ہے۔ وہ جو تقریر بھی کرتے ایک کتاب بن جاتی، اس طرح ان کے دسیوں کتابچے موجود ہیں جو ملکی اور بین الاقوامی حالات پر گہری نگاہ کے غماز ہیں چند کے نام یہ ہیں: (۱) الیکشن اور مسلمان (۲) ہندوستان کا مستقبل اور جماعت اسلامی کی دعوت (۳) جماعت اسلامی کا مقصد اور طریق کار (۴) حالاتِ حاضرہ اور ہماری ذمے داریاں (۵) ملک وملت کے چند قابل توجہ مسائل (۶) مغرب میں اسلام کی دعوت (۷) ملک وملت کے مسائل اور مسلمانوں کی ذمے داریاں (۸) جماعت اسلامی حقائق اور الزامات (۹) ملک وملت کے مسائل اور ان کا حل (۱۰) بھارت کی تعمیر اور ہم (۱۱) پس چہ باید کرد (۱۲) تشکیل

جماعت اسلامی ہند کیوں اور کیسے؟ وغیرہ''۔

مولانا کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ عہد جوانی میں انہوں نے علمی وادبی مضامین لکھ کر مدینہ بجنور ،الضیاء لکھنؤ،الاصلاح سرائے میر اور دعوت اخبار دہلی وغیرہ میں شائع کرا کے علم وادب کے میدان میں ایک بڑا نام پیدا کیا اور اپنے خطابات ، بیانات اور تعلقات کے ذریعے قومی وملی حلقہ میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا اور اپنی بھرپور صلاحیتوں کو استعمال کرکے جماعت اسلامی کی ذمے داریوں کو بڑے صبر واستقامت اور حکمت عملی کے ساتھ بخوبی انجام دیا اور اس کی کارکردگی میں اضافہ بھی کیا۔ مولانا نے ہندوستان میں قوم وملت کی خوشحالی اور خدمت خلق کی غرض سے ایک ضخیم کتاب ''مسلمانانِ ہند اور مسئلہ انتخاب'' کے نام سے لکھی جس کا ایک حصہ بعد میں ''مسئلہ انتخابات'' کے نام سے شائع ہوکر کافی مقبول ہوا۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کو دین اسلام کی حمیت اور اس کی اقامت پر آمادہ کرنا اور ملکی احوال کے پیش نظر پہلے جنرل الیکشن سے دور رہنے پر زور دینا تھا، مگر بعد میں مولانا کی رائے الیکشن کے سلسلے میں بدل گئی اور وہ اس کی اہمیت وافادیت پر زور دینے لگے۔ چونکہ مولانا کا خیال یہ تھا کہ مسلمان الیکشن میں حصہ لیں گے تو عوام سے ان کا تعلق بنا رہے گا اور ملکی حالات کے پیش نظر جو بھی مسائل درپیش ہوں گے مسلمان اس کا مداوا کرکے عوام اور ملک دونوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرسکیں گے اس سلسلے میں انہوں نے ''پس چہ باید کرد'' کے عنوان سے دعوت اخبار دہلی میں الیکشن کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے:

''ہمارے نزدیک الیکشن کی اہمیت جو کچھ بھی ہے وہ کسی مادی منفعت کے بجائے اس پہلو سے ہے کہ یہ پبلک سے ربط رکھنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے، اور پبلک سے تعلق پیدا کرکے مسلمان ملکی حالات ومسائل پر بھی اپنا مخصوص اثر جو ڈالنا چاہتے ہیں ڈال سکتے ہیں کیونکہ بہرحال یہاں جمہوریت رائج ہے اور جمہوریت اپنے تمام تر نقائص وکمزوریوں کے باوجود حالات پر اثر انداز ہو رہی ہے اور آئندہ جمہوری مزاج کے ارتقا کے ساتھ اس میں بھی مزید ترقی رونما ہونے والی ہے''۔

مولانا نے ۱۹۴۰ء میں بحیثیت استاذ پہلی بار اصلاح تشریف لاکر درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا اور مدرسہ کی مجلس تعلیمی کے اخیر دم تک رکن بھی رہے۔ اس کے علاوہ مدرسہ کی تاریخ میں پہلی بار وسیع پیمانے پر مولانا فراہی کے افکار وخیالات سے متعلق سیمینار کا انعقاد کرکے ان کی شخصیت اور کارناموں کو ملکی اور غیر ملکی ارباب علم ودانش سے متعارف کرایا اور وقتاً فوقتاً مدرسۃ الاصلاح پر ہنگامی صورت میں علماء

حضرات کے ساتھ تعلیم وتعلم کی خدمت بھی انجام دی۔ ۱۹۴۶ء میں مولانا سرائے میر کے حلقوں میں امیر مقامی منتخب ہوئے اور تقریباً دوسال بعد الہ آباد کے ایک اجتماع میں اتفاق رائے سے امیر جماعت اسلامی ہند مقرر ہوئے ۔ بلاشبہہ سرائے میر کو ابتدا میں کچھ دنوں کے لیے مرکز کا درجہ حاصل رہا لیکن منظوری کے بعد جماعت اسلامی ہند کا مرکز لکھنؤ سے قریب ملیح آباد سے متصل محمود نگر میں منتقل ہو گیا جہاں سے تحریک اسلامی ہند کے سفر کا آغاز ہوا۔ چونکہ مولانا کو جماعت اسلامی اور اس کی تحریک سے بے پناہ لگاؤ تھا جس کا بنیادی نصب العین صرف اقامت دین ہے اس کے لیے انہوں نے اپنا جسم وجان، مال ودولت، گھر بار اور اپنی زندگی کے ایک ایک پل کو نچھاور وقربان کیا۔

مولانا کا رجحان دین اسلام اور اس کی سر بلندی کی طرف شدت سے تھا وہ مسلمانوں کو آسمان کی بلندیوں پر سرخرو دیکھنا چاہتے تھے اور اسی جذبے کے تحت انہوں نے جماعت اسلامی کی قیادت سنبھالی تھی، اس میں شک نہیں کہ اس وقت ہندوستان میں جماعت کی امارت کے لیے افضل وموزوں ترین شخص مولانا ابواللیث اصلاحیؒ ہی تھے جنہوں نے چوبیس سال تک امارت کا منصب سنبھالا اور کم وبیش بتیس سال تک اس عہدے پر فائز رہے جس کے درمیان تقریباً آٹھ سال کا وقفہ بھی رہا اس وقفے میں مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعت مقرر ہوئے، مگر جب جماعت اسلامی اور مسلمانوں پر ایک ناگہانی آفت ومصیبت مسلط ہوئی اور مستقبل کی طرف سے سخت تشویش لاحق ہوئی تو ایسے نازک حالات میں مولانا کو ۱۹۸۱ء میں جماعت اسلامی کی قیادت دوبارہ سنبھالنی پڑی اور بڑے ہی صبر واستقلال کے ساتھ ہندوستان کے گوشے گوشے میں متعدد دورے کر کے دعوت اسلامی کو عام کیا۔ اس سلسلے میں وہ کئی بار جیل بھی گئے، جہاں پر انہوں نے دعوت حق کا فریضہ بخوبی انجام دیا۔ اور جماعت اسلامی کی تحریک کو اس بحرانی کیفیت سے نجات دلانے میں حتی المقدور کوشش بھی کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا راستہ نہایت ہی پر خطر اور مشکلات سے گھرا ہوا تھا پھر بھی وہ انہی راستوں پر چلے جن پر چلنا آسان نہ تھا وہ حق کے لیے نرم اور باطل کے لیے سخت تھے اور ان کے یہاں فکر کی گہرائی سمندر سے زیادہ گہری اور ارادے کی پختگی ہمالیہ سے زیادہ ٹھوس تھی، باطل کی تھپیڑے اور ظلم کی آندھیاں ان کے عزم کے سامنے ہار جاتی تھیں اور یہ شخص ہر چیز سے بے پرواہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں رہتا تھا۔

۱۹/مارچ ۱۹۹۰ء کو جب مولانا امارت کے منصب سے سبکدوش ہوئے تو اس وقت جماعت اسلامی ہند، ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے منظم اور اعلیٰ درجے کی جماعت بن چکی تھی اور اس کی قیادت

وسربراہی مولانا کی سبکدوشی کے بعد مولانا محمد سراج الحسن صاحب کے سپرد کردی گئی۔ بعد میں قیادت میں متعدد بار تبدیلی بھی عمل میں آئی۔ مگر مولانا ابواللیث صاحب کی قیادت وسربراہی کا اتنا طویل مدت تک تحریکوں اور جماعتوں کی تاریخ میں ایک نمایاں ریکارڈ ہے، جواس بات کی کھلی ہوئی شہادت ہے کہ اقامت دین کا یہ داعی اور تحریک اسلامی کا یہ مبلغ خدا اور خلق خدا دونوں کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ بندہ تھا، جنہوں نے معاملات اور تعلقات کی دنیا میں ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کیا اور ان کے حقوق کی پاسداری کرتے ہوئے حتی الامکان اپنی طرف سے کوئی فروگزاشت نہ ہونے دی اور نہ ہی مال ودولت، جاہ وحشمت اور نام ونمود کی تمنا کی بلکہ ملک وملت کی خوشحالی کے لیے اپنے آپ کو نچھاور اور قربان کیا۔ اس سلسلے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ان سے اجر میں کمی واقع ہوتی ہے، ہمیشہ آخرت کو مدنظر رکھو۔ صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو وہ پوری زندگی دنیا کو آخرت کے لیے زادراہ سمجھتے تھے۔ رات کے آخری پہر بیدار ہوتے، تہجد ادا کرتے اور انتہائی خشوع وخضوع اور گریہ وزاری کے ساتھ دعا واستغفار میں مشغول رہتے، یہاں تک کہ اکثر رقت طاری ہوجایا کرتی اور ان کا یہ عمل زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا۔

یکم دسمبر ۱۹۹۰ کو ان کی طبیعت ناساز ہونے کے سبب صبح کے وقت وہ حسب معمول ٹہلنے نہ جاسکے اور جب رات کے وقت طبیعت میں مزید گرانی آئی تو انہیں اعظم گڑھ شہر کے ایچ ایم ہاسپٹل میں داخل کرایا گیا جہاں پر مسلسل چار دن تک زیر علاج رہے اور آخر کار ۵/ دسمبر ۱۹۹۰ء کو دس بجے دن میں حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے تحریک اسلامی کا یہ نیر اعظم ہمیشہ ہمیش کے لیے غروب ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حوالہ جات

۱۔ ماہنامہ رفیق منزل، دہلی اکتوبر ۱۹۹۱ء ص ۸

۲۔ ایضاً ص ۶ تا ۷

۳۔ الیکشن اور مسلمان، بحوالہ دعوت اخبار دہلی ۲۸/ فروری ۱۹۵۱ء ص ۳۶ تا ۳۷

رضا کار

ضیاء الرحمن محمد شفیع فلاحی

پی جی آئی اسپتال لکھنؤ کے ڈاکٹر نے مجھے کوسٹ سرٹیفیکٹ دینے سے یکسر انکار تو نہیں کیا تھا مگر تردد میں ضرور تھا، بھلا ایسا کوئی شخص جس کا مریض سے دور دور تک کا کوئی واسطہ نہ تھا وہ کینسر کے خلاف اس کی جنگ میں اس کے والدین کا ساتھ کیوں دینے آیا ہے؟

کچھ ہی دیر میں ان کے سارے سوالوں کا جواب ملک و بیرون ملک مقیم میرے کئی رضا کار ساتھی ہسپتال کے سبھی متعلقہ شعبوں میں رابطہ کر کے دے رہے تھے۔ ہاسپٹل کے ڈائریکٹر اور ایم ایس کی طرف سے مریض کی سبھی تفصیلات مجھے فوری طور پر مہیا کیے جانے کے احکامات جاری ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں میرا ہر ممکن تعاون کرنے اور میرے توسط سے مطلوبہ وزارتوں کے نام خطوط ارسال کرنے کو بھی کہا گیا۔

سات سال کے بچے ''ارتھو'' کو کینسر تھا، اس کی والدہ ٹویٹر پر مجھے ملیں اور انھیں لگا تھا کہ ٹویٹر پر سیاستدانوں اور اداکاروں سے رابطہ ہو جاتا ہوگا اور ان سے بات چیت کر کے وہ اپنے بچے کے علاج میں مدد کی گہار لگائیں گی، مگر اتفاق سے انھیں صرف مایوسی ہاتھ لگی، ان کی روداد سننے کے بعد پورے معاملے کی جانچ پڑتال ضروری تھی، لہٰذا میں لکھنؤ پہنچا۔ ہاسپٹل میں کسی داڑھی والے نوعمر رضا کار یا ان کی اپنی زبان میں سوشل ورکر سے مل کر پہلے تو ہاسپٹل کا عملہ بھروسہ کرنے کی حالت میں نہیں تھا، اب انھیں اعتبار تو ہو گیا تھا مگر ساتھیوں سے ٹیلیفون پر سنی ہوئی دوسری رفاہی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیل سے جاننا چاہ رہے تھے۔

کہانی شروع ہوتی ہے دس سال پہلے، ٹویٹر میرے لیے بالکل نئی جگہ تھی، مجھے پیغامات کا جواب دینا اور انگلش میں کچھ پوسٹ کرنا نہیں آتا تھا، حالانکہ جیسا کہ میں نے میرے ہینڈل (پیج) کا نام انفو ممبئی InfoMumbai@ رکھا تھا، میرا ارادہ تھا کہ پہلے سے کروڑوں کو سموئے ہوئے اس شہر میں

نئے آنے والے خاص کر شمالی ہند کے باشندوں اور غیر ملکیوں کی رہنمائی کروں یا انھیں دھوکے باز دوکانداروں، ٹیکسی والوں اور نوکریوں کے نام پر پیسے ٹھگنے والوں سے بچا سکوں، پھر بھی ایک عرصے تک تجربے کی کمی اور زبان کی ناپختگی کی وجہ سے ناکامی ہاتھ لگتی رہی۔

ووڈافون کے ساتھ کام کرتے ہوئے دوستوں کا حلقہ وسیع ہوتا گیا۔ انگلش پر عبور نہیں تھا، محفلوں میں شرمندگی بھی ہوتی رہی، البتہ انگلش اخبارات پڑھنے اور انگلش نیوز چینل دیکھنے کی وجہ سے الحمد للہ بہتری آتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ ٹویٹر پر زیادہ وقت دینے لگا۔

شروع میں بالکل اجنبی چہروں کی وجہ سے مانوس نہیں ہو پایا پھر دھیرے دھیرے لگنے لگا جیسے اسی دنیا میں میرے جیسے بہت ہیں۔ اجنبی، گھر بار سے دور، کچھ کرنا چاہتے ہیں، کچھ بننا چاہتے ہیں، اپنے ماں باپ کا سر اونچا کرنے کے لیے کسی بھی قیمت پر کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص جائز و ناجائز کی پرواہ نہیں کر پا رہا ہے، کچھ لوگ اپنے شعار کو چھوڑ کر، کچھ اپنی پسند ترک کر کے حتی کہ کچھ اپنی عزت و عصمت کا سودا کر کے کسی مہذب انڈسٹری میں شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرتے دیکھے گئے، مگر کوشش سب کی ایک جیسی، صبح میں ہی اٹھ جانا، دن بھر بھاگتے رہنا، عروس البلاد کی آنکھیں خیرہ کر دینے والی چمک دمک میں کچھ لوگ ایسے کھوئے ہوئے ملے جنھوں نے جس مقصد سے اڑان بھری تھی وہ مقصد ہی بھول گئے تھے اور پر پرزے مضبوط ہونے کے بعد آشیانے کی طرف لوٹنے کے بجائے ان ترستی نگاہوں کو یکسر بھول چکے تھے جنھوں نے امنڈتے سیلاب لیے بمشکل انھیں الوداع کہا تھا، لوگ بڑھاپے کا سہارا بننے کے بجائے ان کے لیے درد کا سامان بن گئے تھے۔

شہر میں جا کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

اس چمک دمک سے میں بھی متأثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا تھا، مقصد میں ناکامی اور تنہائی کے باوجود بھی ممبئی میرے خوابوں کی نگری بن چکی تھی، ماں باپ کی سختیوں اور گھر کی پابندیوں سے آزاد نام نہاد کھلی فضا میں سانس جو لینے لگا تھا۔

ماہ و سال پر لگا کر اڑتے گئے، ایک دن اچانک یاد آیا کہ گھر بار چھوڑے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں۔ مگر جو حاصل کرنا تھا حاصل نہیں کر سکا تھا، کون سا منھ لے کر گھر جاؤں گا، اس لیے گھر جانے کا خیال ہی دل سے نکال دیا اور روزمرہ کی سرگرمیوں میں پھر سے مصروف ہو گیا۔ لیکن آفس سے لوٹنے کے بعد

کافی وقت خالی رہنے کی وجہ سے بار بار گھر والوں کی خاص کر ماں کی یاد آتی رہتی۔سوچا کیوں نہ خالی اوقات میں کچھ کیا جائے۔

پھر شروع ہوا مشوروں کا سلسلہ۔

سب سے زیادہ مشورے پارٹ ٹائم نوکریوں کے آرہے تھے۔ایک دن میں نے ایک امریکی کمپنی میں پیسے دے کر ممبر سازی شروع کر دی، پھر ایک دن ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب (اللہ انھیں دشمنان اسلام کے شر سے محفوظ رکھے) ان سے استفسار کرنے پر پتہ چلا کہ کسی بھی ایسے کام میں جس میں کام شروع کرنے سے پہلے پروڈکٹ خریدنا پڑے پھر دائیں بائیں چین سسٹم میں مزید لوگوں کو جوڑنا پڑے یہ نیٹ ورک مارکیٹنگ کہلاتا ہے اور یہ بالاتفاق حرام ہے۔

اس سے توبہ کی اور پھر سے بقیہ اوقات میں خالی رہنے لگا۔

ٹویٹر پر شہر کے ہسپتالوں سے خون کی ضرورت کے لیے لوگ مجھے لکھتے،کبھی کبھار سننے میں آتا کہ میری درخواست پر انھیں خون کا عطیہ مل گیا ہے اور مریض کے اہل خانہ میرا شکریہ ادا کرتے، مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتے تو مجھے بہت خوشی ہوتی، سنا تھا کہ خوشیاں بانٹی جاتی ہیں تاکہ بڑھیں اور غم میں شریک ہونا چاہیے تاکہ درد کم ہو، یہ بات سچ ثابت ہوتی ہوئی دکھائی دینے لگی، کچھ دنوں بعد علاج و معالجے میں رقم سے امداد، زخمی پرندوں اور جانوروں کی مرہم پٹی، تیزاب حملوں کی شکار عورتوں کے تعاون، شہر کے کسی حصے میں پانی یا بجلی کی کوئی شکایت اور ماحول کے تحفظ کے سلسلے میں درخواستیں ملنے لگیں، جس میں اکثر و بیشتر کا حل میرے پاس نہیں ہوتا تھا مگر شکایت کے ازالے کی کوشش میں بلدیہ اور انتظامیہ کے لوگوں سے رابطہ رہنے لگا اور وہ مسائل حل بھی کرنے لگے۔

ایک ہی سال کے عرصے میں ملک کے کسی بھی حصے میں آفات ارضی وسماوی کی صورت میں اقوام متحدہ سمیت کئی قومی اور بین الاقوامی اداروں اور تنظیموں سے بحیثیت رضا کار وابستہ رہنے لگا اور اس دوران متاثرہ علاقے کے رفاہی کاموں میں کامیاب 'آن لائن' یا 'آن گراؤنڈ' کوآرڈی نیٹر بنا رہا۔ دوسرے رضا کار ساتھیوں سے بھی بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔

حادثات کے اس دور میں جہاں لوگ اکثر اوقات میں سوشل میڈیا پر اپنے قیمتی اوقات ضائع کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور بجائے اس کے کہ پاس میں موجود پریشان شخص کی پریشانی دور کرکے اس کی مدد کی جائے حادثات کے شکار لوگوں سے ہمدردی کا اظہار کرکے صرف زبانی جمع خرچ کا

مظاہرہ کرتے ہیں۔ایسے میں ہزاروں رضا کاروں کا اپنی نوکریوں سے چھٹی لے کر، اپنے ذاتی اخراجات پر متاثرہ علاقے کا سفر کرنا اور مہینے دو مہینے گزارنا بلاشبہہ ایک قابل تعریف اور قابل تقلید معاملہ لگا۔

ایسے بے شمار لوگ اکثر غیر معروف رہ جاتے ہیں اور انھیں نہ میڈیا مشہور کرتی ہے اور نہ ہی حکومتیں حوصلہ افزائی، بہر حال ان سب باتوں سے بے پرواہ ہزاروں ملکی اور لاکھوں غیر ملکی رضا کار اپنی بے لوث خدمات سماج کو ہدیہ کرتے رہتے ہیں اور ایسے لوگ بقیہ خود غرض اور مطلب پرست معاشرے کے نام نہاد انسانوں سے الگ زندگی جی کر دلی خوشی حاصل کرتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی سماجی ذمہ داری بھی پوری کرتے ہیں۔

افسوس! ہمارے مسلمان بھائی اور خاص کر علماء دوسروں کے بہ نسبت ایسی سرگرمیوں میں بہت پیچھے دکھائی دیتے ہیں۔

سوچئے، جب بوڑھا مانجھی گاؤں والوں کی آسانی کے لیے صرف ایک ہتھوڑے اور چھینی کی مدد سے تیس فٹ چوڑے اور پچیس فٹ اونچے پہاڑ کو کاٹ سکتا ہے، جب بہار کے شیام بہاری پرساد دہلی میں بھیک مانگ رہے بچوں کو مفت میں سالوں سے پڑھا کر ان بچوں کی زندگیاں بدل سکتے ہیں، جب دہلی کے لکشمی نگر کے آکاش بھاردواج ٹراویل ایجنسی چلا کر صرف نابیناؤں کو روزگار پر رکھ کر ایک مثال قائم کرسکتے ہیں، جب ستر سال کے ہورہے حیدرآباد کے گنگادھر تلک اپنی پنشن سے پیسے خرچ کر کے ہزاروں خطرناک سڑک کے گڑھوں کو بھر سکتے ہیں، جب ساٹھ سالہ پین چالیس سال تک اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر کلکتہ فائر بریگیڈ میں مفت نوکری کر سکتے ہیں، جب جھارکھنڈ کے بنٹی راؤ ممبئی کے ساحلوں پر پچاسوں لوگوں کو ڈوبنے سے بچا سکتے ہیں، جب سارتھ بابوسو سے زائد لاورث اور بھکاری بچوں کی سرپرستی کرسکتے ہیں، جب ممبئی کی ورشا وید لوگوں کو Eye Banks سے رجسٹر کروا کے سینکڑوں نابیناؤں کو دوبارہ دیکھنے والی نگاہیں مہیا کرا سکتی ہیں، جب بنارس کے اجیت سنگھ ہزاروں بچیوں کو عصمت فروشی کے دلالوں کے چنگل سے بچا سکتے ہیں۔ جب بھوپال کے غلام دستگیر اپنی زندگی داؤ پر لگا کر سینکڑوں کو بچا کر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں؟

جب بھی ارتھو جیسے بچے کے لیے کسی مسلمان نے کوشش کی ہے، برادران وطن کے ذہنوں سے تعصب ختم ہوا ہے، اسلام کے بارے میں رائے بدلی ہے اور ان شاء اللہ بدلے گی۔ کوشش کر کے تو دیکھئے، کبھی کسی کو گلے لگا کر تو دیکھئے، اپنا بنا کر تو دیکھئے۔

بچے کی تربیت میں ماں کا رول

خنساء سبحانی، دہلی

قرآن پاک نے عورت کو بہت اونچا مقام دیا ہے۔اس نے عورت کو وہ عزت دی ہے جو اس سے پہلے کبھی اسے حاصل نہ ہوئی، البتہ ماں کی حیثیت سے تو عورت کا کردار اور مقام بہت ہی بلند ہو جاتا ہے۔اسلام کے نزدیک ماں کی ہستی انتہائی بلند ہستی ہے، ایک اچھی اور دیندار ماں کی رضا و خوشی میں اللہ ورسول ﷺ کی رضا و خوشی ہے، اور اس کی ناراضگی اللہ ورسول ﷺ کی ناراضگی ہے۔

بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ماں کا وجود ایک شجر سایہ دار کی طرح ہوتا ہے۔ ماں کا یہ اعلیٰ مقام اور اتنی اہمیت کیوں ہے؟

ماں کے عزائم، خیالات، افکار و عقائد کا اثر لازمی طور پر اولاد پر پڑتا ہے۔ ماں ایک درخت ہے تو اولاد اس کی شاخیں اور پھل، ماں ایک پھول ہے تو بچے اس کی خوشبو، اولاد ماں کے خوابوں کی تعبیر اور اس کی سیرت و کردار کا نمایاں عکس ہوتی ہے، حقیقت میں ماں کی گود بچے کی پہلی درسگاہ و تربیت گاہ ہے۔یہیں سے اس کی ذہن سازی ہوتی ہے۔یہیں سے انسانی خوبیاں، صلاحیتیں اور قابلیتیں پروان چڑھتی ہے، یہیں پر داعیان دین اور مجاہدین اسلام کی تربیت ہوتی ہے۔

بچوں کی یہ تربیت گاہ جتنی پاکیزہ اور مؤثر ہوگی، تربیت پانے والے اتنی ہی بہترین سیرت و کردار کے حامل ہوں گے۔مثال کے طور پر حضرت سلیمانؑ کی والدہ جو انتہائی متقی و پرہیزگار خاتون تھیں اور اپنے بیٹے کی تربیت کے لیے شب و روز فکر مند رہتی تھیں، اپنے بیٹے کو نصیحت کرتی ہیں...

''پیارے بیٹے! رات بھر نہ سوتے رہا کرو اس لیے کہ رات کے اکثر حصے کو سو کر گزارنا انسان کو قیامت کے دن مفلس بنا دے گا''۔ یہ ایک دوراندیش ماں کی قیمتی نصیحت ہے۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ نے اپنی آغوش محبت میں جس بچے کی تربیت کی وہ عظیم ہستی

عبداللہ بن زبیرؓ کی ہے۔ سیدہ اسماء اپنے بیٹے کو اسلام کا جانباز سپاہی بنانا چاہتی تھیں، بچپن میں ہی تیروں اور تلواروں کے مقابلوں کا مشاہدہ کراتیں تا کہ وہ جرأت منداور بہادر بن سکے، وہ اپنے بیٹوں کو جہاں جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتیں وہی اپنے بچوں سے مخاطب ہوکر کہتیں:

''میرے بچو! مال جمع کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ حاجت مندوں کی امداد کے لیے ہوتا ہے، اگر تم بخل کرو گے تو اللہ بھی تمہیں اپنے فضل وکرم سے محروم رکھے گا، ہاں صدقہ کرو گے اور راہ خدا میں خرچ کرو گے تو وہ تمہارے کام آئے گا کہ اس ذخیرے کے ضائع ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں''۔

بچپن سے لے کر شہید ہونے تک انھوں نے اپنے فرزند کی بہت ہی اچھی تربیت کی۔ امام شافعیؒ کی والدہ نے جب ان کو حصول علم حدیث کے لیے مدینہ بھیجنے کا ارادہ کیا تو ان کے پاس سوائے دو چادروں کے کچھ بھی نہ تھا ان کو دینے کے لیے، انھوں نے کہا:

''بیٹا! تو میرے پاس اللہ کی ایک امانت ہے۔ اب میں اس کی امانت اسی کے حوالے کرتی ہوں، میں سچے دل سے سمجھتی ہوں کہ خدا تجھے ہر آفت سے بچائے گا''۔ یہ کہنے کے بعد بیٹے کو گلے سے لگایا اور یوں دعا کی:

''اے میرے پالنے والے! میں اپنے لخت جگر کو تیری راہ میں تیرا دین سیکھنے کے لیے بھیج رہی ہوں، اے میرے رب! جس طرح تو نے میری یہ دعا سن لی کہ میرے بیٹے کے دل میں علم دین سیکھنے کا شوق پیدا کیا، اسی طرح اب اس کے شوق کو پورا فرما۔ اپنی طرف سے اس کی مدد کر اور میری زندگی میں اسے دین کا سب سے بڑا عالم بنا، تا کہ میں اسے دیکھوں اور تیرا زیادہ سے زیادہ شکر ادا کروں''۔ کتنی نیک اور عظیم تھیں یہ ماں!! اللہ رب العزت کی ذات پر کتنا زبردست بھروسہ تھا! تنگ دستی کے باوجود اپنے بچے کے لیے کتنی حسین تمنا رکھتیں تھیں۔

امام بخاریؒ کی والدہ بہت ہی حوصلہ مند خاتون تھیں۔ اللہ پر کامل یقین رکھتی تھیں۔ امام بخاریؒ ابھی بہت کمسن تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا، ان کی والدہ نے بہت ہی صبر وحوصلے کے ساتھ اپنے شوہر کی جدائی کو برداشت کیا اور اپنے بیٹے کی پرورش وتربیت کے لیے یکسو ہوگئیں لیکن ان کو اس وقت بہت صدمہ ہوا اور وہ غمزدہ ہوگئیں جب انھوں نے اپنے لخت جگر کو دونوں آنکھوں سے محروم دیکھا۔ بچے کو نابینا دیکھ کر اس کے روشن مستقبل کے تعلق سے ماں پریشان ہوگئی۔ اپنی تمناؤں کی تکمیل نہ ہوتے دیکھ کر وہ بہت زیادہ فکر مند تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کو حدیث رسول کا سب سے بڑا عالم بنانا چاہتی تھیں۔ انھوں

نے اللہ تعالی کی رحمت کے دروازے کو کھٹکھٹانا شروع کر دیا اور پورے خلوص اور سچی نیت کے ساتھ اللہ کے حضور گڑگڑا کر رونے اور دعا کرنے لگیں:

''اے اللہ! میری تمناؤں کو پورا کر دے''۔ ایک بار نہیں بار بار اپنے بچے کی بینائی کے لئے روئیں اور دعا کرتی رہیں کیونکہ دعا ہی مومن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ بالآخر اللہ نے ان کی دعا سن لی اور ان کی بینائی واپس کر دی۔ یہ عظیم المرتبت خاتون کون تھی؟؟ یہ تھیں امام بخاریؒ کی والدہ ماجدہ۔

سلطان ٹیپو شہیدؒ کی والدہ نے شروع ہی سے پختہ نیت کی تھی کہ وہ اپنے لخت جگر کی بہترین تربیت کریں گی۔ اپنے بیٹے کو مرد صالح و مرد مجاہد بنانے کے لیے جہاں وہ اللہ رب العزت سے دعائیں کرتیں وہیں عملی طور پر اس کے لیے کوشش بھی کرتیں۔ وہ اپنے عزیز بیٹے کو دودھ پلانے سے پہلے وضو کرتیں اور دو رکعت نفل نماز پڑھتیں۔ انھوں نے سلطان ٹیپوؒ کی ایسی تربیت کی کہ وہ انتہائی بہادر و نڈر حکمراں بن گیا، ایسا بہادر جس کا نام لے کر انگریز عورتیں اپنے بچوں کو ڈراتی تھیں۔ سلطان ٹیپو نے سر کٹانا تو گوارہ کر لیا لیکن کبھی باطل کے آگے سر نہیں جھکایا اور ملت کے جوانوں کو یہ پیغام دیا کہ گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔

سلطان ٹیپو شہیدؒ کے اندر جرأت وشجاعت کا جوہر اور احکام خداوندی کی اطاعت کا جذبہ کس نے پیدا کیا؟ یقیناً ان کی پاکباز اور دیندار ماں نے۔

آج پھر ملت اسلامیہ کو انہی جیسی قابل فخر آغوش مادر کی ضرورت ہے۔ کاش ایسی مائیں بننے کی تمنا ہماری تمام بہنوں کے اندر پیدا ہو جائے اور وہ عملاً کچھ کر دکھائیں۔

افسوس کہ آج کی مائیں اس کے برعکس تربیت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، آج وہ اپنے بچوں کو چوہے، بلی، کتوں اور بھوت پریت سے ڈراتی ہیں، اور جب بچہ بولنا سیکھتا ہے تو بچے کے گانا گانے، گالی دینے اور ڈانس کرنے سے اپنی تربیت پر ماتم کرنے کے بجائے اکثر مسلم مائیں خوش ہوتی ہیں۔

وہ مغربی کلچر کو اپناتے ہوئے، بچے کو اس کے ابتدائی دور ہی سے پلے اسکول اور چائلڈ ہاؤس کے نام پر خود سے دور کر دیتی ہیں اور خود سروس و بزنس میں لگ جاتی ہیں، جبکہ ہر ایک جانتا ہے کہ بچے کی یہ عمر ماں کی ممتا و محبت اور قربت چاہتی ہے۔ اس طرح بچہ بہت کچھ سیکھنے سے محروم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ عمر ہوتی ہے جس میں ماں اپنی میٹھی میٹھی لوریوں اور ممتا سے اس کی بہترین تربیت کر سکتی ہے، کیونکہ ایک ماں ہی ہوتی ہے جو بچے کو بولنا شروع کرنے کے وقت کلمہ سکھاتی ہے اور اللہ کا نام کہلواتی ہے اور موقع

موقع سے صحابہؓ اور انبیاءؑ کے واقعات سناتی ہے، سوتے وقت دعائیں یاد کراتی ہے، وہ نماز پڑھتی ہے تو بچہ بھی اس کی نقل کرتا ہے، قرآن پڑھتی ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ پڑھنا چاہتا ہے، غرض یہ کہ چلتے پھرتے وہ ایک اچھی اور بہترین تربیت کرسکتی ہے، کیونکہ اس عمر میں بچہ اپنے ماحول سے ایک ایک چیز سیکھتا اور اس کو ذہن نشین کرتا ہے۔ اس کے برعکس اس کو اگر ایک برا ماحول ملے تو بچے پر اس کے برے اثرات پڑتے ہیں، مثلاً خود کو دن بھر فلمی دنیا میں مصروف رکھنا، نماز و قرآن اور روزے سے کوسوں دور رہنا، چنانچہ بچہ بھی اسی نقش قدم پر چلتا ہے۔

آج کل بچوں کو ہندی میڈیم اور انگریزی میڈیم میں ڈالنے کا فیشن عام ہوگیا ہے، کیونکہ ماں باپ بچوں کو شروع ہی سے یہ خواب دکھانے میں لگ جاتے ہیں کہ یہ تعلیم حاصل کروگے تو اچھی نوکری ملے گی، اچھا بزنس چلے گا، اس طرح وہ دنیوی حیثیت سے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم ان کو قرآن پاک صحیح ڈھنگ سے پڑھنا نہیں آتا، نماز صحیح طریقہ سے نہیں پڑھ سکتے، سنت رسول ﷺ اور سیرت صحابہؓ سے بہت دور رہتے ہیں۔

یہ بات بہت ضروری ہے کہ آپ اپنے بچوں کو کسی بھی نوعیت کی تعلیم کیوں نہ دیں لیکن دین کی تعلیم سے پوری طرح آشنا رکھیں۔ آپ ان کو کسی بھی کالج یا مدرسے میں ڈال کر بےفکر نہ ہوجائیں بلکہ ان کی تربیت پر پوری توجہ دیں۔ ان کے رہن سہن پر، ان کے طور طریقے پر، ان کی بول چال پر نظر رکھیں۔ آپ بچوں کو آپس میں ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارنے سے منع کریں اور نہ ہی خود ایسا کریں مثلاً تم بےوقوف ہو، پاگل ہو، پھسڈی ہو، بدھو ہو، ان الفاظ کا بچوں کے ذہن پر، ان کی شخصیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ بچے سچ مچ اپنے آپ کو ایسا ہی محسوس کرنے لگتے ہیں، انھیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ پاگل، بےوقوف ہیں۔

ایک دوراندیش ماں وہ ہوتی ہے جو اپنے بچے کو اس طرح کے احساسات سے دور رکھتی ہے، مثال کے طور پر تھامس ایڈیسن کے ٹیچر نے اس کی والدہ کو یہ پیغام بھیجا کہ آپ کا بچہ دماغی طور پر کمزور ہے، آپ اس کی پڑھائی کا گھر ہی میں بندوبست کرلیں، لیکن اس کی ماں نے جب اپنے بچے کو یہ خط پڑھ کر سنایا تو اس کے الفاظ یہ تھے: ''آپ کا بچہ بہت ہی زیادہ ذہین ہے، اسکول میں اس کے معیار کے مطابق کوئی ٹیچر نہیں ہے، آپ گھر ہی میں اس کی پڑھائی کا انتظام کرلیں''۔

ماں کے مرجانے کے بعد تھامس ایڈیسن کو اسکول کا وہ خط اس وقت ملا جب وہ بڑی بڑی

ایجادات کر چکا تھا، چنانچہ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ میری ماں نے ایک کند ذہن ناکارہ بچے کو سائنس داں بنا دیا۔

یہ ایک حوصلہ منداور باشعور خاتون کی تربیت کا نتیجہ تھا۔بچوں کی اچھی تعلیم وتربیت بہت مشکل کام ہے،اس کو آسان سمجھ کرنظر انداز نہ کریں۔ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت پر کم ہی توجہ دی جاتی ہےاور جولوگ توجہ دیتے بھی ہیں وہ ان کوانجینئر،ڈاکٹر اورکلرک ہی بنانا پسند کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہوتا ہے کہ لڑکیاں قاری، حافظ، عالم، فاضل نہیں بن سکتیں۔یہ تعلیم اور یہ مقام صرف مردوں ہی کے لیے خاص ہے، اسلام نے عورت کو یہ مقام نہیں دیا ہے، ایسا سوچنا سراسر غلط ہے۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے مردوں اورعورتوں میں بالکل امتیاز نہیں کیا۔اسلام نے زندگی کی تعمیر کا جونقشہ دیا ہے اس کے کسی بھی گوشہ میں عورت کی حیثیت مجروح نہیں ہونے دی ہے۔ تاریخ کے صفحات عورتوں کے زریں کارناموں سے بھرے پڑے ہیں۔کسی بھی کام میں عورت پیچھے نہیں رہی ہے۔

...... قبول اسلام کا سہرا سب سے پہلے ایک عورت ہی کے سر بندھا، وہ ہیں ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ۔

...... اسی طرح اسلام کی راہ میں سب سے پہلے اپنے خون کا نذرانہ پیش کرنے والی ایک خاتون ہی ہیں وہ ہیں حضرت سمیہؓ۔

...... اسی طرح اسلامی معاشرے کی تعمیر میں حضرت خنساءؓ کا رول رہتی دنیا تک کے لیے مشعلِ راہ ہے، کس طرح انھوں نے اپنے چاروں بیٹوں کے اندر خدا کی راہ میں قربان ہونے کا جذبہ پیدا کیا۔

...... خود ام حکیمؓ عکرمہؓ بن ابوجہل کی بیوی نے رومیوں کی جنگ میں سات رومیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

...... حضرت ام عمارہؓ کی تعریف نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ ’’جنگ احد کے موقع پر دائیں بائیں جس طرف بھی رُخ کیا ام عمارہؓ ہی کو دیکھا‘‘۔

...... اسی طرح ام شریکؓ جب مشرف باسلام ہوئیں تو مدینہ کے ایک ایک گھر جا کر دعوت کا کام کرتی تھیں۔

...... علم وفضل میں بڑے بڑے حفاظ حدیث کے ساتھ ام المومنین حضرت عائشہؓ کا نام لیا جاتا ہے۔

...... حضرت صفیہؓ جنھوں نے غزوہ احزاب کے موقع پر انتہائی جرأت کے ساتھ یہودی جاسوس کا کام تمام کر دیا اور اس کی گردن تن سے جدا کر کے قلعہ سے باہر پھینک دی، قلعہ میں موجود خواتین اور بچوں کی حفاظت کی خاطر، جس سے دشمنان اسلام کے دلوں میں خوف پیدا ہو گیا۔

لیکن موجودہ دور میں جبکہ مغربی تہذیب کی یلغار ہے اور شیطانی تہذیب کے علمبردار اپنی تہذیب کو مسلمانوں پر تھوپنے کے لیے اور فحاشی کو عام کرنے کے لیے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا (موبائیل، انٹرنیٹ، کمپیوٹر، ٹی وی وغیرہ) کے ذریعے اپنے اپنے انداز میں سرگرم عمل ہیں۔ اس نے آزادی کے نام پر عورتوں کو گھر سے باہر نکال دیا ہے، اس کی عزت و آبرو، اس کے حقوق و احترام کو پامال کر دیا ہے، اور اسے سامان تجارت بنا کر رکھ دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ فحاشی اور بے حیائی و بے پردگی کا دور دورہ ہے، نیکیاں اور بھلائیاں کم سے کم تر ہوتی چلی جارہی ہیں۔

ایسے میں ہمارے معاشرے میں ایک اور بہت بری بیماری کا رواج ہوتا جارہا ہے اور وہ ہے اولاد کا کم سے کم ہونا۔ اولاد کو لوگ بوجھ سمجھنے لگے ہیں، اور اس کے زیادہ ہونے کو معیوب سمجھنے لگے ہیں۔

وہ مغربی کلچر کو اپناتے ہوئے فیملی پلاننگ کے نام پر دو یا تین اولاد کو بس سمجھتے ہیں اور اس کے بعد اس کی رکاوٹ کے نسخے اپنانے لگتے ہیں۔ سرجری، انجکشن اور دواؤں کے ذریعہ سے اس پر روک لگاتے ہیں، نعوذ باللہ۔ یہ برائی پورے معاشرے میں بہت تیزی سے عام ہوتی جارہی ہے۔ لوگ اس کو ایک فیشن سمجھنے لگے ہیں، کیونکہ ملت نے قرآن مجید اور سنت رسول کو فراموش کر دیا ہے۔ وہ بھول گئے کہ ہمارے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ’’بچے جنت کے پھول ہیں، بچے آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں، بچے گھر کی رونق ہیں، بچے رزق میں برکت ہیں، اللہ تعالی ان کی روزی کا خود انتظام کرتا ہے‘‘۔ لہٰذا ہماری ماؤں کو چاہیے کہ وہ اللہ کی مرضی میں دخل اندازی کرنے سے پرہیز کریں۔ اللہ ہم سب کو ہدایت دے اور ہماری خطاؤں کو معاف کرے۔

کیا عذر تراشو گی آخر ؟
جب حشر میں پوچھا جائے گا

افسانہ ’’مسنگ مین‘‘ کا تجزیہ

ڈاکٹر ابو ارشد فلاحی،
اسسٹنٹ پروفیسر یو۔ٹی۔آر۔سی،سولن۔ہماچل پردیش
ای میل:abu_arshad2007@rediffmail.com

یوں تو ’’مسنگ مین‘‘ بدلتے ہوئے حالات،گزرتے ہوئے وقت،قدروں کی شکست وریخت، نسلی تفاوت اورانفرادی تشخص کوقائم رکھنے کی ناکام کوشش کاافسانہ ہےلیکن صرف اتنا کہہ دینے سے بات نہیں بنتی۔راوی کا کوئی نام نہیں ہےاس کی پہچان اولاد اور باپ کی شکل میں ہوتی ہے، جسے ہم گرامر کی اصطلاح میں اسمِ عام سےتعبیر کرتے ہیں۔یہ اسمِ عام ایک پوری نسل کی علامت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

افسانہ کی شروعات ان جملوں سے ہوتی ہے’’ہمارے اپنے مکان کی دیواروں پرمیری پسند کارنگ ابھی چڑھنا شروع ہی ہوا تھا کہ اسے دیکھ کرمیرے بچّوں کی ناک بھوں سکڑ گئی۔بیٹا بولا پاپا یہ کیسا رنگ کرا رہے ہیں؟ پلیز اسے روک دیجیے؟ہاں پاپا یہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہے۔مویا کوئی اور نیا کلر کرائیے، بیٹی بھی بول پڑی‘‘۔

یہاں دونسلوں کے الگ الگ سوچنے کے انداز کے ساتھ ساتھ راوی کے اپنے وجود اور تشخص کو منوانے کا بھی پتہ چلتا ہے۔موجودہ نسل نئے اور پرانے کے بیچ کس طرح پس رہی ہے اسے غضنفر نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔راوی افسانے کا ایک فعال کردار ہے جس نے خود کو دونسلوں کے درمیان رکھ کر کہانی بیان کی ہے۔گویا مسنگ مین دونہیں بلکہ تین نسلوں کی کہانی ہے۔ایک وہ نسل ہے جو گزر گئی، دوسری وہ جو موجود ہے، تیسری آنے والی جسے نئی نسل کہہ سکتے ہیں۔راوی کے والد کا تعلق اس نسل سے ہے جو گزر گئی۔راوی کا تعلق موجودہ نسل سے ہےاوراس کی اولاد کا تعلق آنے والی نئی نسل سے

ہے۔ یہ تینوں کردار تین زمانوں یعنی ماضی، حال اور مستقبل کے نمائندے ہیں، بالفاظ دیگر نہ صرف یہ کہ یہ تین زمانوں کی نمائندگی کرنے والے کردار ہیں بلکہ تینوں زمانے کے علامیہ بھی ہیں۔ گویا تینوں نسلوں کے درمیان جو چیز مشترک ہے وہ ہے وقت۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ قدریں کس طرح تبدیل ہوتی ہیں، راوی نے اسے اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے یہ کسی ایک کی نہیں بلکہ ہر ایک کی کہانی ہے۔ افسانے سے چند اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''پاپا یہ بہت ڈَل اور بھدا لگ رہا ہے اس سے تو مکان کی بیوٹی ہی خراب ہو جائے گی'' بیٹے نے خرابیاں گنوائیں۔

''پاپا سنی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ بہت بیکار کلر ہے'' بیٹی نے تائید کی۔

''نہیں نہیں یہ رنگ اچھا ہے یہی ٹھیک رہے گا''۔

یا یہ جملہ کہ ''ہاں میں ضد کر رہا ہوں میں ضدی ہوں اور اب وہی ہوگا جو میں چاہوں گا''۔

ان جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ راوی اپنے تشخص کو لے کر پریشان ہے۔ یہاں اس کی ''انا'' بغاوت کرنے پر اکساتی بھی ہے لیکن بیوی بچّوں کی اداسی اور پڑھائی میں بھنگ پڑ جانے کا واسطہ دے کر خاموش کر دیتی ہے۔ یہاں راوی کی طرف سے اپنے تشخص کو باقی اور قائم رکھنے کی کوشش صاف نظر آتی ہے۔ راوی کے اپنے تشخص کو قائم رکھنے کی جھلک اس وقت بھی سامنے آتی ہے جب اس کے باپ اسے شہر کے مشن اسکول میں پڑھانے کے بجائے گاؤں کے مدرسے میں پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں، وہ اپنے باپ سے کہتا ہے۔

''ابا میں گاؤں کے مدرسے میں نہیں پڑھوں گا۔ میں شہر کے مشن اسکول میں جاؤں گا''۔

''کیا کہا تو مدرسے میں نہیں پڑھے گا۔ مشن اسکول میں جا کر کرسٹان بنے گا''۔

''خبردار جو وہاں جانے کی بات کی تو۔''

ایک اور موقعے پر اپنے باپ سے ضد کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''ابا میں رنگین سائیکل لوں گا۔ نیلی ہینڈل اور لال فریم والی، جس کے پہیے پتلے پتلے ہوتے ہیں۔''

''نہیں ہرکلس ٹھیک رہے گی۔ وہ مضبوط ہوتی ہے''

''نہیں میں تو وہی لوں گا''

’’میں نے کہہ دیا نا کہ ہرکلس سائیکل آئے گی۔
’’نہیں میں ہرکلس نہیں لوں گا مجھے تو رنگین سائیکل چاہیے‘‘۔

آپ نے دیکھا دونوں جگہ زمانی قدریں اس کے پاؤں سے لپٹی ہوئی ہیں۔ایک جگہ راوی اپنے باپ کی فرماں برداری یا خوف سے اس کا حکم ماننے پر مجبور ہوتا ہے اور دوسری جگہ اولاد کا اداس چہرہ، ان کی محبت اسے اپنی ضد پر قائم نہیں رہنے دیتے۔ جب کہ دونوں جگہوں پر وہ بغاوت کرسکتا تھا لیکن اس کے سنسکار کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ اس کا تشخص مٹ رہا ہے پھر بھی کوشش کے باوجود خود کو اخلاقی قدروں اور خاندانی حدبندیوں سے باہر نہیں نکال پا رہا ہے۔اس کے برعکس اس کے اپنے بچے باپ کی اداسی کا اثر لینے کے بجائے ٹیلی ویژن پر مزاحیہ سیریل دیکھنے میں محو ہو جاتے ہیں۔ان کی یہ حرکت اس بات کی شاہد ہے کہ ان کے ذہن و دل پر باپ کی اداسی اور پریشانی کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔اس واقعہ کی تفصیل کے لیے افسانہ سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

’’میرے جی میں آیا کہ میں دیکھوں میری اداسی کا کوئی اثر میرے بچّوں پر ہے یا نہیں، اور میں اپنے کمرے سے اٹھ کر ان کے کمرے میں چلا گیا۔ دونوں بچے ٹیلی ویژن پر کوئی مزاحیہ سیریل دیکھنے میں محو تھے۔ میرے آنے کا انھوں نے نوٹس بھی نہیں لیا۔ میں اکثر اپنے بچوں کو خوش کرنے میں اداس ہوا۔ ان کی ضد پوری کرنے میں میرا دل دُکھا۔ میری اَنا مجروح ہوئی، میرے اندر شدید خواہش جاگی کہ بچوں کو میرے اندر کی کیفیت کا احساس ہو۔ وہ مجھ سے میری اداسی کا سبب پوچھیں۔ افسوس کا اظہار کریں مگر وہ ہر بار اپنی ضد کی کامیابی کی خوشی میں مجھے بھول گئے‘‘۔

ان جملوں سے راوی کی پریشانی صاف جھلک رہی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ سنی اور اس کی بہن پر باپ کی اداسی کا کچھ بھی اثر نہیں ہے، اور تو اور دونوں اپنی جیت اور کامیابی کی خوشی کا جشن ٹی وی پر مزاحیہ سیریل دیکھ کر منا رہے ہیں۔ یہاں قدروں کی شکست و ریخت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔موجودہ نسل کے اندر وہ بات نہیں ہے جو پہلے تھی۔ پہلے اولاد کو اپنے والدین کی خوشی اور ان کی عزت و ناموس کا پاس تھا۔ اب اولاد کے لیے والدین کی خوشی اور ان کی عزت و ناموس سے بڑھ کر اپنی خوشی اور عزت و ناموس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنی اور اس کی بہن اپنے والد کی اداسی اور غم کا نوٹس لیے بغیر ٹیلی ویژن پر مزاحیہ سیریل دیکھ کر اپنی کامیابی کی خوشی کا جشن منا رہے ہیں، ان کی اس حرکت سے راوی کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ دکھ کا یہ احساس اسے ماضی میں پہنچا دیتا ہے۔ جب اس کی ضد پر اس کے والد اسے طمانچہ مارتے

ہیں جس کے سبب وہ دیر تک لکھوری اینٹوں والی کوٹھری میں اس امید پر سسکتا رہا،'' کہ ابا میرے پاس آئیں گے اور میرے آنسو پونچھیں گے۔ مجھے پچکاریں گے۔'' مگر وہ نہیں آتے۔اس واقعہ کی یاد نے اسے اور زیادہ رنجیدہ کر دیا۔اس کی اداسی اور گہری ہوگئی،اس کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔

یہ افسانہ ہماری موجودہ نسل کا المیہ ہے اور اس کو غضنفر نے بہت خوبصورتی سے پکڑا ہے۔ پہلے ہم اپنے والدین سے ڈرتے اور دبتے رہے اور اب اپنے بچوں کو خوش کرنے اور ان کی ضد پوری کرنے میں خود کو تکلیف میں مبتلا کر رہے ہیں۔شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری موجودہ نسل ہم سے اچھا سوچتی ہے۔ہم سے زیادہ ذہین ہے اور ہم سے زیادہ دنیا کی چیزوں کو سمجھتی ہے۔اس کہانی میں تہہ داری بھی ہے،علامت بھی۔اور کہانی وہی بڑی ہوتی ہے جو کم سے کم الفاظ میں انسانی احساس کو جھنجوڑ کر رکھ دے۔غضنفر نے رنگ کو علامت بنا کر جس خوبی سے جنریشن کو بانٹنے کا کام کیا ہے،اس کی تصویر دیکھنے کے لیے ان جملوں کو ملاحظہ کیجیے۔

''دیوار سے دونوں رنگ اُتر کر میری آنکھوں میں داخل ہو گئے۔دونوں رنگ جگنوؤں کی طرح آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔۔۔اور آخر میں وہ رنگ ابھرا جسے دیواروں کے لیے میں نے پسند کیا تھا اور اسی کے ساتھ وہ رنگ بھی ابھر آیا جسے بچّوں کی ضد نے ابھارا تھا اور جو دیوار سے اُتر کر میری آنکھوں میں داخل ہو کر اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔۔۔رفتہ رفتہ ایک رنگ اترتا گیا، پھیکا پڑتا گیا۔اور دوسرا جمتا گیا، گاڑھا ہوتا گیا۔گاڑھے رنگ پر میری نگاہیں مرکوز ہوگئیں۔یہ میرے بچوں کا رنگ تھا جسے ان کے بچپن کی ضد نے ابھارا تھا۔''

غضنفر نے رنگ کو علامت بنا کر جنریشن کو بانٹ دیا ہے،یہ ایک تجریدی بیان ہے اور جو دیوار والی بات انھوں نے کہی ہے یہاں اندرونی اور بیرونی چیزوں کے ذکر سے جنریشن کو جوڑ دیا ہے۔اس سے یہ افسانہ پوری طرح compact ہوگیا ہے اس طرح بے ربطی میں Under current ایک ربط محسوس کیا جا سکتا ہے۔یہ مابعد جدیدیت کی شناخت ہے،اس لیے یہ اچھی کہانی ہے۔ہماری جو نسل ہے وہ پہلے بھی پسی تھی اور اب بھی پس رہی ہے۔یہ افسانہ علامتی افسانوں کی طرح جدید ہوتے ہوئے بھی کہانی پن سے خالی نہیں۔

دونوں جگہوں پر راوی کے اپنے وجود کا مسئلہ ہے۔راوی اپنے اندر جس رنگ کو تلاش کرتا ہے بچپن میں وہ رنگ اسے اپنے ابا کے پاس نظر آتا ہے۔اور اب جبکہ وہ خود ابا بن گیا تو وہ رنگ اسے اپنے بچوں

کے پاس نظر آیا جس کا اظہار افسانہ نگار نے ان لفظوں میں کیا ہے:''میں نہ یہاں تھا اور نہ وہاں''۔

غضنفر کا یہ افسانہ موجودہ نسل کا المیہ ہے جسے اس نے بہت خوبصورتی سے پکڑا ہے اور جدید رنگ میں ایسی خوبی سے نبھایا ہے کہ کہانی کہیں بھی ابہام کا شکار نہیں ہوئی ہے۔ اپنی بات نہایت واضح اور صاف انداز میں کہی ہے۔ پہلے ہم اپنے والدین سے ڈرتے اور دبتے رہے اور اب اپنے بچوں کا خیال کرتے ہیں۔ یہ تصویر ایک فردِ واحد کی بھی ہے اور ایک پورے معاشرے کی بھی۔

یہ افسانہ موجودہ سماج کی انارکی میں رشتوں کی شکست و ریخت، اقدار کی پامالی اور درونِ خانہ کشمکش کی فنکارانہ انداز میں آئینہ داری کرتا ہے۔ اس میں افسانہ نگار کی زندگی تانے بانے کی صورت میں یا پھر ابھرتے مٹتے نقوش کی شکل میں ہمیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہانی اپنے قاری کو کئی جہتوں پر سوچنے اور عمل کرنے پر ابھارتی ہے۔ اس لیے بغیر کسی تذبذب کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کہانی بہت اہم ہے۔

افسانے کا عنوان اور انداز دونوں ہی دلچسپ ہے۔ اس افسانے کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ غضنفر کے اندر اچھے الفاظ کو مناسب جگہ رکھنے کا شعور ہے۔ یہ چیز انہیں منٹو سے قریب کرتی ہے۔

جدیدیت میں جو انتہا پسندی آئی اس سے لوگ گھبرا گئے، لیکن غضنفر اس کا کوئی اثر لیے بغیر اپنے مخصوص انداز میں لکھتے رہے۔ یہ کسی کو برا نہیں کہتے، چاہے ترقی پسندی ہو یا جدیدیت یا مابعد جدیدیت، کیونکہ ادب کی تخلیق میں تینوں کا اہم رول رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کسی اِزم سے جوڑنا بھی نہیں چاہتے، وہ ہر دور کے صالح عناصر کو اختیار کر کے آزادی سے اپنے خیال کو تخلیق کا حصّہ بناتے ہیں۔ یہی ان کی کامیابی کا راز ہے، موضوع چاہے جو بھی ہو لیکن غضنفر اپنے فن سے اسے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔

نایاب خطوط

ذیل میں معروف اسلامی دانشور مولانا وحید الدین خاں صاحب کے تین خطوط بنام مولانا محمد فاروق خاں صاحب شامل اشاعت کیے جا رہے ہیں۔
*توفیق خداوندی شامل حال رہی تو اس کالم کے تحت آئندہ بھی اہم اور نایاب خطوط کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا رہے گا۔ (**مدیر**)*

(۱)

تاریخ مذکور نہیں
وحید الدین خان
۹۔ بدرقہ، اعظم گڑھ
برادرم جناب فاروق خاں صاحب

سلام مسنون

آپ کو ایک زحمت دے رہا ہوں۔ ''خدا موجود ہے'' نامی کتاب میں پہلے یا دوسرے مضمون میں ایک بحث ہے براہ کرم اس کو نقل کر کے بھیج دیں۔ وہ بحث اس دعوے کی تردید میں ہے کہ کائنات کی تخلیق ''اتفاق'' سے ہوئی ہے۔ اتفاق (Law of chance) ریاضی کا ایک مسلمہ ہے۔ مگر یہ قانون اتفاق موجودہ کائنات کے وجود میں آنے کے لیے جس مدت کا طالب ہے وہ کائنات کی معلوم عمر سے ٹکرا رہی ہے۔ کیونکہ ارضیاتی تحقیق سے کافی صحت کے ساتھ زمین کی عمر دریافت ہوگئی ہے۔ لیکن یہ عمر اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ اتفاقات کے ذریعہ موجودہ نوعیت کی زمین وجود میں آجائے۔

اسی بات کو اس میں سائنسی طور پر سمجھایا گیا ہے۔ آپ براہ کرم اس حصہ کو نقل کر کے مجھے اعظم گڑھ کے پتہ پر بھیج دیں۔

۲۔ وہاں جماعت کے کتب خانہ میں ایک کتاب ہے:

Modern Scientific thought

اس کتاب میں جیمز جینز کا ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے:

Mysterious Universe

اس مضمون کے شروع میں قانون اتفاق کی یہ مثال دی گئی ہے کہ اگر آپ کثیر مقدار میں سکہ (Penny) کو فضا میں اچھالیں تو آدھا چت گرے گا آدھا پٹ۔ اس مثال کو پیش کرنے سے پہلے چند فقروں میں یہ بات لکھی ہے کہ ''اتفاق''، محض کوئی الل ٹپ چیز نہیں ہے بلکہ وہ ایک قانون ہے۔ یہی ایک فقرہ یا چند فقرے جو مثال سے پہلے ہیں ان کے اصل الفاظ نقل کر کے بھیج دیں۔ غالباً مضمون کے شروع ہی میں یہ ہے۔ آپ آخر میں Index کے اندر Law of chance کا عنوان دیکھ لیجیے گا، وہاں سے معلوم ہو جائے گا کہ کس صفحہ پر ہے۔

براہ کرم یہ دونوں چیزیں نقل کریں، کر کے بھیج دیں۔ پہلی چیز ذرا لمبی ہوگی۔ مگر دوسری کے صرف ایک یا چند فقرے ہوں گے۔

ممکن ہو تو جلد بھیجیں اور رجسٹری سے

خادم

وحید الدین

(۲)

اعظم گڑھ۔

۷/فروری ۱۹۶۳ء

برادر مکرم

سلام مسنون

آپ کا خط ملا۔ میں نے اب اپنے آئندہ کام کے بارے میں ایک پروگرام بنایا ہے اور وہ پروگرام یہ ہے کہ فی الحال میں چند سال علی گڑھ میں گزاروں۔ اس سفر کا خاص مقصد ایک کتاب کی تیاری اور اس کے سلسلہ میں مطالعہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں پڑھے لکھے لوگوں کے اندر عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا ہے

کہ جدید سائنسی حقائق نے مذہب کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ ہکسلے کے الفاظ میں جدید معلومات ایک قسم کا علمی دھماکا (Knowledge Explosion) ہیں، جس کے بعد خدا اور مذہب کے متعلق تمام خیالات بھک سے اڑ گئے ہیں۔ میں اسی عنوان پر ایک کتاب تیار کرنا چاہتا ہوں جس میں اس دعوے کا جائزہ لے کر اسے رد کیا گیا ہو۔

اس سلسلہ میں ایک تو خود جدید مادہ پرست اور عقلیت پسند لوگوں کی ان تحریروں کو پڑھنا ہے جس میں مذہب کے خلاف دلائل جمع کیے گئے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ عیسائی مفکرین کے ان جوابات کو دیکھنا ہے جو مذہب کی طرف سے مندرجہ بالا دعوے کی تردید میں تیار کیے گئے ہیں۔ ان حضرات نے بنیادی تصورات کی حد تک، جدید علمی سطح پر، مذہب کی طرف سے بہترین مدافعت کی ہے اور علمی استدلال کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ جدید سائنسی دریافتیں مذہب کے حق میں ہیں نہ کہ اس کے خلاف۔

یہ مطالعہ ان شاء اللہ بیک وقت مندرجہ بالا کتاب لکھنے میں مددگار بھی ہوگا اور آئندہ جو دینی خدمت میرے پیش نظر ہے، اس کے لیے علمی تیاری کا ذریعہ بھی۔ اس سلسلہ میں فی الحال میں نے دو سال کا پروگرام بنایا ہے لیکن اگر ضرورت ہوئی تو اس میں مزید توسیع بھی ہو سکتی ہے۔

اس کتاب کا نام اس وقت وہی ذہن میں آ رہا ہے جو اس سے پہلے مضمون کے عنوان کے طور پر ذہن میں آیا تھا، یعنی ''علم جدید کا چیلنج''۔

امید ہے کہ میں ان شاء اللہ یکم مارچ تک علی گڑھ کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ نیز یہ بھی امکان ہے کہ یہ سفر بریلی کے راستے سے ہو۔ اگر بریلی ہو کر گیا تو ان شاء اللہ بریلی میں آپ سے دوبارہ ملاقات بھی ہو سکے گی۔

۱۹ر جنوری کو میں نے مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب کے نام ایک ضروری خط روانہ کیا تھا۔ مگر اب تک اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ آپ ان سے مل کر میرا سلام کہیں اور میری طرف سے یہ پیغام پہنچا دیں کہ میں اپنے مندرجہ بالا خط کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔

بچے آپ کو سلام کہہ رہے ہیں۔

خادم

وحیدالدین

(۳)

برادر محترم مولانا محمد فاروق خان صاحب

سلام مسنون

عرصہ سے ملاقات کا موقع نہ نکال سکا۔ یہ میری بدقسمتی ہے۔ رفیق منزل اپریل ۲۰۰۴ء میں آپ کا مضمون ''رجوع الی اللہ'' پڑھا۔ اس میں آپ نے سورہ التغابن آیت ۲؍کی تفسیر کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ ہماری ظاہری شکل وصورت کو ہی نہیں اس نے بہتر وحسین بنایا بلکہ ہماری موت کو بھی اپنی جناب میں حاضری قرار دے کر اسے بھی حسین معنویت عطا فرمائی۔ ہماری دنیوی زندگی کا اختتام درحقیقت اس کی ملاقات کا پیش خیمہ ہے۔ کتنا خوش تر ہے یہ انجام حیات۔''

یہ بڑی انوکھی تفسیر آپ نے بیان فرمائی ہے۔ متداول تفسیروں میں عام طور پر یہ مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ ''ای الیہ المرجع، فیجازی کلا بعملہ۔''

آپ نے جو تفسیر کی ہے اس سے آیت میں نئی وسعت ومعنویت پیدا ہوگئی۔ جزاکم اللہ۔

ان شاء اللہ کسی وقت ملاقات کی کوشش کروں گا۔

دعا گو

وحید الدین خان

۳؍اپریل ۲۰۰۴ء

نعت رسول پاک ----- سید راشد حامدی فلاحی، نئی دہلی

اللہ کے احکام کی، فرمان کی خوشبو
سرکار کی باتیں ہیں کہ قرآن کی خوشبو
کردار میں، گفتار میں ایمان کی خوشبو
آئینہ قرآں میں ہے قرآن کی خوشبو
قرآن پڑھا میں نے تو ہر لفظ سے آئی
مزّمّل ومدّثّر وفرقان کی خوشبو
اللہ نے بلایا تھا انہیں عرش بریں پر
افلاک میں ہے آج بھی مہمان کی خوشبو
ہر قول وعمل آپؐ کا تصدیق شدہ ہے
ہے آپؐ کی ہر بات میں برہان کی خوشبو
والشّمس میں ہے مہرنبوت کا اُجالا
واللیل میں ہے صبح کے امکان کی خوشبو
لولاک لما کی یہی توجیہ ہے شاید
عالم ہے فقط آپ کے فیضان کی خوشبو
ہے آپؐ کا احساں کہ ہمیں فرق بتایا
وہ کفر کی بدبو ہے یہ ایمان کی خوشبو
دنیا! مرے آقا کی پناہوں میں چلی آ
ہے ان کے ہی دامن میں سمادھان کی خوشبو
اک جامع قرآں ہے تو اک ناشرِ قرآں
ہے دین میں صدیق کی، عثمان کی خوشبو
بے تاب ہے اڑنے کے لیے سوئے مدینہ
آنکھوں سے ٹپکتی ہوئی ارمان کی خوشبو
بس ایک ہی خوشبو تھی لب پاک سے جاری
سبحان کی، سبحان کی، سبحان کی خوشبو

نوائے مومن

کریں اہل کلیسا لاکھ اپنی سعی امکانی
مٹا سکتے نہیں حق رخ زیبا کی تابانی
کریں مطعون یہ جتنا بھی چاہیں ذات والا کو
نہیں گھٹ پائے گی شمع رسالت کی ضوافشانی
نہ دو الزام ظلمت ہم کو ظلمت کے پرستاروں
ہمارا دین ہے اول سے آخر دین نورانی
ارے ناداں تو کیوں جلتا ہے اس ذات مطہّر سے
ہوا ہے اور نہ ہوگا حشر تک اس کا کوئی ثانی
ملا ہے درگہ حق سے ہمیں یہ رتبہ عالی
کہ ہم ہیں خیرامت ، تم سراپا شروطغیانی
تمہارے کون سے حاکم نے دنیا کو دکھائی ہے
ابوبکر وعمر، عثمان وحیدر جیسی سلطانی
ہمارے عہد زریں میں یہ دنیا رشک جنت تھی
مگر اب ہر طرف کردی ہے تم نے خوں کی اَرزانی
عداوت اور نفرت کے علاوہ کیا دیا تم کو
عطا کی ہم نے دنیا کو محبت کی فراوانی
تمہاری کھوکھلی تہذیب میں آخر دھرا کیا ہے
بہیمیت، خباثت، بے حیائی اور عریانی
زوال آمادہ ایسی قوم کو سمجھو تم اے عارف
جو بن جاتی ہے حیواں کھوکے اپنی شانِ انسانی

حافظ احسان الحق عارف آئمی،
شیخ التفسیر کلیۃ البنات، جامعۃ الفلاح

غزل

گزرنے والی ہوا کو بتادیا گیا ہے
کہ خوشبوؤں کا جزیرہ جلادیا گیا ہے
زمیں کی آنکھ کا نقشہ بنادیا گیا ہے
اور ایک تیر فضا میں چلا دیا گیا ہے
اُسی کے دم سے تھا روشن سیاہِ شب کا علَم
وہ چاند جس کو زمیں میں دبا دیا گیا ہے
وہ ایک راز! جو مدّت سے راز تھا ہی نہیں
اُس ایک راز سے پردہ اٹھادیا گیا ہے
تمہیں پتہ نہیں خانہ بدوش امّیدو؟
نیا علاقہ سرِ جاں بسادیا گیا ہے
جہاں ہوا تھا بصارت کا قتلِ عام نبیلؔ
وہاں اک آئینہ خانہ بنادیا گیا ہے

عزیز نبیلؔ،قطر

غزل

کیف میں اپنے ہی رہتا ہوں میں سرشار بہت
بس اسی بات پہ نالاں ہیں مرے یار بہت
منزلیں دیتی گئیں مجھ کو مسافت کی نوید
مرحلے مجھ پہ گزرتے رہے دشوار بہت
ایسا اثبات بھی تشکیل ہوا ہے مجھ میں
بھر دیا جس نے مری ذات میں انکار بہت
تلخیاں سہنے کی عادت مری، کام آ ہی گئی
اب کے موسم مری شاخیں ہیں ثمر دار بہت
کیا خبر اپنے معانی کو پہونچ پائیں گے
لفظ رکھتے ہیں ہمیں در پئے آزار بہت
اک ترے لمس سے پھوٹی ہیں نمو کی راہیں
خاک تھی ورنہ کہاں میری خوش آثار بہت
اب یہاں پھول کی تصویر لگا دی جائے
داغ کو لے کے پریشان ہے دیوار بہت
روشنی آئے کسی طور میرے آنگن میں
تنگ کرتی ہے مجھے اب یہ شب تار بہت

ارشد جمال صارمؔ،
منصورہ طبیہ کالج، مالیگاؤں

یوم مادر

کی مناسبت سے

سال میں بس ایک ہی دن جس کا ماں کے نام ہے
زندگی بے کار اس کی اور برا انجام ہے
اپنی پوری زندگی کر دیجیے اب ماں کے نام
ہے عبث جو یومِ مادر کا مچا ہنگام ہے
"ماؤں کے قدموں کے نیچے جنت الفردوس ہے"
کیسا پاکیزہ یہ قولِ داعیِ اسلام ہے
ماں کو جس نے رتبۂ عالی پہ فائز کر دیا
اور کوئی مذہب نہیں ہے، وہ فقط اسلام ہے
وہ بڑے ہی عقل کے اندھے ہیں اور بدبخت ہیں
جو سمجھتے ہیں کہ ماں تو اک وجودِ خام ہے
قدر ماں کی کیجیے اور جا کے خود ہی دیکھیے
ماں سے ہے محروم جو، کیا اس کی صبح وشام ہے
ہائے اس دنیا سے جب رخصت ہوئی ہے ماں مری
تب یہ جانا ہے کہ ماں کتنا بڑا انعام ہے
تیری رحلت سے ہوئی ویران میری زندگی
اب تو ہونٹوں پر قوی کے بس ترا ہی نام ہے

عبدالقوی عادل، اے ایم یو، علی گڑھ

تعارف وتبصرہ

آخری تعاقب

افسانہ نگار: مرتضیٰ ساحل تسلیمی

صفحات:160، **قیمت**:96روپے، **اشاعت**:2015

ناشر: نور پبلی کیشنز2842 کوچہ چیلان، دریا گنج، دہلی-6

تبصرہ:سعیداختر اعظمی

سماجی مسائل اورمعاشرتی کج رویاں حساس ذہن رکھنے والوں کو کچو کے لگاتی ہیں کہ وہ اس طرف توجہ دیں۔ یہ ذہن صاحب قرطاس وقلم کا ہوتو وہ اپنی منثور ومنظوم تخلیق کے توسط سے سوسائٹی کو آئینہ دکھلانا اپنافرض منصبی تسلیم کر لیتا ہے۔ یہ مسائل کینسر کی مانند ہیں جن کی گاہے گاہے نشتر زنی لازمی ہے تاکہ زہریلا مادہ باہر نکلتا رہے۔ مرتضیٰ ساحل تسلیمی طویل عرصہ سے خواتین واطفال کے رسائل کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھال رہے ہیں۔ انھیں قدرت نے حساس ذہن عطا کیا ہے۔ سماجی بے ضابطگیاں ان کے اندر کے قلم کار کو جھنجھوڑتی ہیں تو وہ قرطاس سے رشتہ استوار کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔

'آخری تعاقب' مرتضیٰ ساحل تسلیمی کا اولین فکشن زاویہ ہے۔ ڈھائی درجن سے زائد ان افسانوں کے موضوعات جہیز، مطالبات اہل نوشہ، شریک حیات کے انتخاب کا معیار، ضیافتوں کے نام پہ اسراف اور رشتوں کی کمیابی ہیں۔ یہ ایسے نادر موضوعات نہیں ہیں جن پہ خامہ فرسائی نہ کی گئی ہو۔ دیگر قلم کاروں کی طرح مرتضیٰ ساحل تسلیمی نے بھی اپنے تخیل، تجربہ اور مشاہدہ کو یکجا کر کے بھرپور صورت گری کی ہے۔ یوں حقیقت پسندی کا اعلامیہ افسانہ قاری کے دل کی آواز بن گیا ہے۔ 'وصیت' حسب نسب کے چکر میں اولاد کے جذبات سے کھلواڑ ہے تو 'رشتے کا کرب' اتفاقیہ ملاقات کے حوالے سے پاکیزہ تعلق کی بنیاد۔ 'پرانی چیز' طعنہ وتشنیع کا نتیجہ بد ہے تو 'اور مراد بر آئی' بروقت کیا گیا درست فیصلہ۔ 'جھک گیا آسمان' انا کی جنگ میں ہونے والی شکست فاش ہے تو 'آخری تعاقب' حالات حاضرہ کا کرب۔ 'عورت کا المیہ' یہ بتلاتا ہے کہ اولاد کی حقیقی تربیت ماں ہی کر سکتی ہے جبکہ 'سرپرائز' گھر سے باہر نکلتے ہوئے اور دوران

ملازمت نسائی وقار برقرار رکھنے کی ترغیب اول ہے۔'کاش' برصغیر کی معاشی ابتری کا بیانیہ ہے جہاں بھکاری کی کمائی آفس کارکن سے زیادہ ہوتی ہے۔'تیسری بیوی' شوہر کے مزاج کے مطابق خود کو ڈھال کر ازدواجی زندگی خوشگوار بنانے والی شریک حیات کی فراست وحکمت ہے تو 'قاتل' حالات کے سامنے سپر ڈالنے کی مجبوری۔'شہ اور مات'،'سبق' سفید پوش نظر آنے والوں کے چہروں کی نقاب کشائی ہے تو 'مجھے معاف کردو' گھریلو ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کرنے پر ندامت۔'فیصلہ' افواہوں پہ توجہ نہ دینے کا مفید ثمرہ ہے تو 'دہشت کے حصار میں' خواہ مخواہ پریشانی مول لینے کی مصیبت۔'انتظار' جنریشن گیپ مٹانے کی کارگر کوشش ہے تو 'خون کا رشتہ' بھائی بہن کے رشتوں کا کھٹا میٹھا پن۔'سانپ' فطرت کی مجبوری ہے تو 'امن کا پیامبر' فرقہ وارانہ یکجہتی کے قیام کی مساعی کا درس۔'نعم البدل' نیکی برباد گناہ لازم۔'گڑیا' حالات سے سمجھوتہ ہے تو 'برے آدمی کی اچھی نصیحت' یہ ہے کہ رفیق بدخصلت سے دور رہو۔'خربوزے کو دیکھ کر' فرنگی تہذیب کی نقالی کے مضر ثمرات ہیں تو 'تضاد قول وعمل کا' نیرنگی عہد حاضر۔'ٹی وی سیریل' طاغوت کے سامنے شکست کی تسلیم ہے تو 'فاقہ زدہ' بھکاریوں کا بہروپ۔'اردو نوازی' محبان لسانیات میر وغالب کے منہ پہ زوردار طمانچہ سے کم نہیں ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ ڈاک سے انجمن عاشقان اردو کی جانب سے سبھی کو دو پوسٹر ارسال کیے گئے جس میں اردو اخبارات ورسائل خریدنے، سرکاری وغیر سرکاری دفاتر میں درخواستیں اردو میں دینے، بچوں کو اردو پڑھوانے لکھوانے، ڈاک خانہ سے متعلق فارم اردو میں پُر کرنے اور پتے اردو میں لکھنے کی اپیل کی گئی تھی جبکہ پتہ انگریزی میں درج تھا۔ کیا اس میں ہمارے لیے کوئی قابل غور نکتہ نہیں؟

احساس

شاعر:سلیمان فراز حسن پوری

صفحات:160،**قیمت**:300روپے،**اشاعت**:2015

پتہ:سلیمان فراز حسن پوری محلّہ کائستھیان،سیفیان مسجد،تحصیل حسن پور امروہہ یوپی

تبصرہ:سعید اختر اعظمی

یادوں کا تسلسل بے چینی، درد، آنسو، اور ہجر سے عبارت ہے۔یہ ایسی سوغات ہے جو وصل کے سرور انگیز لمحات کے بعد جدائی کے کرب کی شدت بڑھا دیتی ہے۔شب وروز اُسی کا ذکر، اُسی کے خواب

اوراُسی کے حوالے۔فریق ثانی نے فراموش کیایا ذہن ودل پہ نقش کرلیایہ الگ سوال ہے ۔اسے درکنارکر کے سلیمان فرازحسن پوری تشنہ لب کی صدائے العطش کی مانند اسے طلب کرتے ہیں۔جانے کیوں وہ مژگاں سے لپٹے خوابوں کوکھرچ کر پھینک دیناچاہتاہے جبکہ محبوب لمحات قربت کونقوش جاوداں بناکراسے دل کےفریم میں سجالینے کامتمنی ہے۔

'احساس' سلیمان فرازحسن پوری کااولین شعری درپن ہے جس میں رومانیت کے شانہ بہ شانہ حالات حاضرہ کی عکاسی بھی ملتی ہے ۔

کوئی مجبور ہوکرہی وطن سے دوررہتاہے نہیں توکون ہے وہ جس کوگھراچھانہیں لگتا

دورحاضر میں رقیبوں کی ضرورت کیاہے دوستوں کےہی کرم توڑ کے رکھ دیتے ہیں

اب ایک چاند سبھی کانصیب کیسے ہو وہ کون ہے جوتری آرزونہیں رکھتا

مفلسی اورکھلونوں کی ضدیں بچوں کی جب گزرتاہوں توبازار سے ڈرلگتاہے

یوں شب ہجر کوآسان بنالیتے ہیں ہم تری یادکومہمان بنالیتے ہیں

نبی کریم ﷺ کی صفات اقدس پرخامہ فرسائی کرنے کودشوارترین مرحلہ ماننے والے سلیمان فرازحسن پوری نے یہ تمنا بھی کی ہے کہ کاش اُن کی دیدکاخواب آنکھوں کے نام ہوجائے۔اس حقیقت سے واقف ہونے کے باوجودکہ 'بغیرآنسومحبت کاسفراچھانہیں لگتا' وہ اُسے دیکھ کر یہ کہنے پہ مجبور ہوجاتے ہیں ۔

اُس کوہرشخص یہاں جان غزل کہتاہے اُس نے ماناہے کسے میر، مجھے کیامعلوم

پھربھی یہ امیدقوی اپنی جگہ قائم ہے۔

سونی سونی سی ان آنکھوں میں چمک لوٹے گی دیکھوچھت پر ہے مراچاند نکلنے والا

حسن بن سلیم سیفی حسن پوری ،شمس رمزی ،مجیب شہزر،مسعودحساس،فرحت اقبال سیفی،م خالد انصاری،عاصم خان اورکمال اختر کی آراسے مرصع 'احساس' پیام محبت عام کرنے کی ترغیب دیتاہے۔

ہم سے آتی نہیں نفرت کی تجارت اے فراز ہم سخنور ہیں محبت کے جلاتے ہیں چراغ

آپ کے خطوط

محمد امین احسن، بلریا گنج اعظم گڑھ۔

صحت مند سماج کی تعمیر وترقی اور تشکیل نو میں ادب اور فنون لطیفہ کا کردار بعینہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ ''متوازن غذا'' کا جسم کو صحت مند رکھنے کے سلسلے میں ہوا کرتا ہے۔ جس طرح سے طبیب حاذق محض تشخیص کے مراحل سے گزرنے کے بعد یہ طے کرتا ہے کہ مریض کے جسم کو صحت مند بنانے کے لیے کون سے رہنما اصول کام میں لائے جائیں جن کے ذریعہ وہ خوشگوار تبدیلیاں واقع ہوسکیں جو طبیب کی نگاہ میں مریض کی صحت کے لے اشد ضروری ہیں۔ یہی صورت حال تخلیق کار کی ہوا کرتی ہے اس کے لیے اس بات کا علم ناگزیر ہے کہ وہ کس سماج کے بارے میں فکرمند ہے، اس میں کیا کچھ خامیاں ہیں اور اس کے کیا منفی اثرات ہیں؟ اس کے اسباب وعلل کیا ہیں؟ اور کس طرح سے انھیں دور کیا جائے کہ سماج اسے ایک خوشگوار تبدیلی کی صورت میں قبول کرلے، جو دراصل تعمیر وترقی کا پیش خیمہ ہیں، اور صحیح سمت متعین کرنے میں ممدومعاون۔

ادب اور فنون لطیفہ کی تخلیق ہر سماج میں مختلف عوامل کے زیر اثر ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح تعمیر وترقی کی تعریف ایک جیسی نہیں کی جاسکتی، ہاں اقدار قدرے مشترک ضرور ہوتی ہیں جو بنیادی ہوا کرتی ہیں اور Society-in-question کا خاصہ نہیں ہوا کرتیں۔

مشرق اور مغرب میں تعمیر وترقی کی تعریف بالکل مختلف ہے اور اسلام میں آتے آتے Fine tuning کے ذریعے اور Refine کردیا جاتا ہے۔ یہ Selectivity process کہلاتا ہے۔ یہ تبدیلی یا دوسرے لفظوں میں ترویج وترقی کے لیے سب سے اہم ہے، بلکہ یہی سب کچھ ہے۔ یہ اسلام کا خاصہ ہے جسے نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کی تعلیم کی روشنی میں Practically demonstrate کیا ہے۔ جو ہمارے لیے (تخلیق کار) رہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اب رہا سوال یہ کہ اسلامی ادب کیا ہے اور اس کو Define کیسے کریں کہ ہر خاص وعام (مسلم/غیر مسلم) کے لیے قابل قبول ہو، میرے لیے یہ بہت مشکل ہے۔ میں بس اتنا کہہ سکتا ہوں جو ادب سماج

کی تعمیر وترقی اور تشکیل میں مثبت کردار ادا کر سکے جس کے اشارات ہمیں نبی اکرمؐ کی زندگی میں واضح طور سے ملتے ہیں اور وہ وہی نتائج اور اثرات سماج پر مرتب کرتے ہیں جس کا اسلام خواہاں ہے، وہ اسلامی ادب کہلائے گا۔ چاہے تخلیق کار مسلم ہو یا غیر مسلم۔ اس کے علاوہ کوئی Line of demarcation اسلامی اور غیر اسلامی ادب کے درمیان نہیں کھینچی جاسکتی۔ ہر سماج یا زبان کے تخلیق کار کے اپنے Norms and standards ہوتے ہیں، جس کے ذریعے ان نتائج کو qualitatively and quantitatively وہ دیکھنا چاہتا ہے اور حاصل کرنے کی بھر پور کوشش کرتا ہے۔

برصغیر کے تناظر میں، مدارس اسلامیہ کا اردو زبان اور ادب کی ترویج اور ترقی میں اہم کردار رہا ہے اور آج تک وہ اس کو بحسن وخوبی نباہ رہے ہیں۔اس کی وجہ واضح ہے۔زیادہ تر مدارس اسلامیہ میں ترسیل علم کا ذریعہ Medium of teaching/ introduction اردو زبان ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو زبان وادب میں اختصاص حاصل کرنا ان کے مقاصد میں شامل نہیں ہے۔لیکن کسی زبان میں اپنی بات کو پیش کرنا کہ متکلم اور سامع/ کاتب اور قاری کے درمیان ایسا ربط قائم ہو جائے کہ کہیں سے بھی تشنگی محسوس نہ ہو خود اس زبان کی ترقی کے لیے ایک مضبوط آلہ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ضرورت کے اعتبار سے کچھ الفاظ اور ان کے مفاہیم متروک ہوتے جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئی تعبیر اور تشریح کے ساتھ دوسرے الفاظ لے لیتے ہیں اور اس طرح سے زبان زمانہ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور زندہ رہتی ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ ہوں یا ان کے رفقاء وتلامذہ، علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، اکبرالہ آبادی یا حسرت موہانی وغیرہ یا موجود دور میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر عبدالحق، یا ابوالکلام قاسمی کو دیکھئے، آپ کی سمجھ میں خود بخود آجائے گا کہ مدارس کے اساتذہ اور طلبہ اردو زبان وادب کی ترویج اور ترقی میں کیا کچھ اور کیسا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ متذکرہ بالا تمام شخصیات کی تعلیم وتربیت کا انتظام کم وبیش اسی طرح کیا گیا تھا جیسا کہ آج کے مدارس اسلامیہ میں حصول علم کے لیے نظم ہے، بس دیدۂ بینا چاہیے۔

ڈاکٹر ابو ارشد فلاحی، اسسٹنٹ پروفیسر، سولن، ہماچل پردیش

گزشتہ دوتین برسوں میں حیاتِ نو کے حوالے سے محمد افضل کے کئی مضامین پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ بڑی خوشی ہوئی کی ایک ایسا شخص جس نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن کے بعد تجارت کو مستقل پیشے کے طور پر اختیار کیا اور شبلی نیشنل کالج سے ایم اے اور بعد ازاں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری

حاصل کی اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج کی مجلسِ شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے اس کے فلاحی کاموں میں سر گرم عمل ہیں۔ موصوف تخلیقی کاموں میں کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین ملک کے رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے زیادہ تر مضامین تنقیدی و تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ کچھ دینی مضامین بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کی زبان کافی سلجھی ہوئی ہے۔ موضوعات کافی دلچسپ ہیں۔

افضل کے جو مضامین میری دلچسپی کا سبب بنے ان میں فاروقی صاحب کے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسمان''، غضنفر کے ناول '' فسوں کا تنقیدی جائزہ''، ''وسعتیں تیرے سخن کی ہیں سمندر کی طرح'' اور'' علامہ شبلی نعمانی: ایک آفاقی شخصیت'' وغیرہ اہم ہیں۔ یہ سبھی تنقیدی و تحقیقی نوعیت کے مضامین ہیں۔ یہ سبھی مضامین نہایت عمدہ ہیں اور کافی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ ان کے عنوان، مواد اور اسلوب سے افضل کی ادبی اور تنقیدی و تحقیقی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ سب سے اہم اور قابلِ ستائش بات یہ ہے کہ افضل کے اندر اسلامی فکر کا عنصر موجود ہے۔ '' ہزاروں چاند اسی آشیاں سے چمکے ہیں'' اسی نوعیت کا مضمون ہے۔ افضل نے اپنے اس مضمون میں دینی مدارس کی خدمات، ان کی اہمیت اور موجودہ دور میں مدارسِ اسلامیہ سے لوگوں کی بے رغبتی اور اس کی وجوہات سے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے اور ساتھ ہی یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ علم اس احساس و شعور کا نام ہے جس سے خدا ترسی، فکرِ آخرت اور پاکیزگیِ اخلاق کا جذبہ و شوق پیدا ہو۔ اور یہ سب باتیں دینی علوم کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے دنیا کے دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ دینی تعلیم کے بغیر معاشرے کے اندر انصاف، مساوات، باہمی رواداری اور صالح روایات و اقدار کو قائم نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ افضل کا مطالعہ کافی وسیع اور گہرا ہے۔ اگر یہ ذوق اور شوق قائم رہا تو آنے والے وقت میں ادب کے نقادوں میں ان کا نام شامل ہوگا۔

ع   اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

میں حیاتِ نو کے اراکین بالخصوص ابوالاعلیٰ سید سبحانی کو بھی مبارک باد دیتا ہوں کہ اس کا معیار ہر اعتبار سے بلند ہوا ہے۔ دینی مضامین کے ساتھ ادبی مضامین کو جگہ دے کر رسالے کو جو وسعت بخشی ہے اس سے حیات نو کے قارئین میں اضافہ ہوا ہے۔ حیات نو کی اشاعت میں تسلسل، معیار میں محسوس اضافہ اور مضامین میں تنوع سے رسالے کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور اس کا سرکولیشن بھی بڑھا ہے۔ یہ رسالے کے لیے بڑی خوش آئند بات ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں دین کی خدمت کرنے کی توفیق بخشے۔

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی، استاذ شعبہ اعلی، جامعۃ الفلاح

جامعہ کے مختلف شعبوں میں نئی تقرریاں

۲۳/جولائی ۲۰۱۷ء بروز یکشنبہ جامعہ کے مرکزی لائبریری ہال میں مختلف شعبہ جات کے لیے انٹرویوز ہوئے، جس میں درج ذیل معلمین ومعلمات وملازمین کی تقرری عمل میں آئی:

(۱)	جناب ذاکر نعمانی صاحب	شعبہ اعلی طلبہ
(۲)	جناب محراب علی فلاحی صاحب	شعبہ اعلی طلبہ
(۳)	جناب قاری مطیع الرحمٰن صاحب	شعبہ حفظ طلبہ
(۴)	جناب قاری شرف الدین صاحب	شعبہ حفظ طلبہ
(۵)	جناب عبدالہادی صاحب	شعبہ مالیات
(۶)	محترمہ محسنہ اثیر فلاحی صاحبہ	شعبہ ابتدائی طالبات
(۷)	محترمہ ثنا آصف صاحبہ	شعبہ ابتدائی طالبات
(۸)	جناب محمد اظفر صاحب	شعبہ ثانوی طلبہ
(۹)	جناب شیر افگن فلاحی صاحب	شعبہ رابطہ عامہ
(۱۰)	محترمہ سلمیٰ ناز صاحبہ	شعبہ اعلی طالبات

اللہ تعالی تمام ہی نو واردین کو اپنی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے، آمین ثم آمین

معمل اللغۃ کی جانب سے مولانا عمار اجمل مدنی کا خطاب

۹/اگست ۲۰۱۷ء بروز چہارشنبہ جامعہ کے مرکزی لائبریری ہال میں معمل اللغۃ کی جانب سے مولانا عمار اجمل مدنی صاحب کا ایک محاضرہ بعنوان ''القراءۃ والمکتبۃ'' عربی زبان میں منعقد ہوا۔ مہمان

موصوف نے اپنے خطاب میں طلبہ کو پڑھنے اور محنت کرنے پر ابھارا۔ محنت کس طرح کی جائے، لائبریری سے کیسے استفادہ کیا جائے، اور اپنے معیار تعلیم کو کیسے بلند کیا جائے، جیسے اہم نکات پر گفتگو کی۔ نظامت کے فرائض جامعہ کے سابق استاذ جناب مولانا محمد اکمل فلاحی صاحب نے انجام دیئے۔

معمل اللغۃ کی جانب سے مولانا عبیداللہ طاہر فلاحی کا لکچر

۲۱/اگست ۲۰۱۷ء بروز دوشنبہ بعد نماز مغرب ابواللیث ہال میں جناب مولانا عبیداللہ طاہر فلاحی مدنی صاحب کا ایک لکچر بعنوان ''مہارات المکتبۃ الشاملۃ'' ہوا، جس میں عربی چہارم تا فضیلت کے طلبہ نے شرکت کی۔ جناب مولانا عبیداللہ فلاحی مدنی صاحب نے اپنے محاضرہ میں قلم کی اہمیت پر گفتگو کی، مکتبات کی ابتداء کیسے ہوئی، نوادرات کی اہمیت کیا ہے، اسی طرح آپ نے اپنی گفتگو میں مکتبہ شاملہ کا تعارف کرایا اور اس سے استفادہ کرنے کا طریقہ بتایا کہ اس کے ذریعہ وقت کی کتنی بچت ہوتی ہے، اور اس وقت مکتبہ شاملہ کی کتنی اہمیت ہے، نیز مکتبہ جبرئیل اور اردو مکتبہ شاملہ کا بھی تعارف کرایا۔ آخر میں طلبہ کے سوالات کے جوابات بھی دیئے گئے۔ نظامت کے فرائض جناب مولانا مصباح الباری فلاحی صاحب نے انجام دیئے۔

جمعیۃ الطالبات کی نئی ذمہ داران کا انتخاب

جامعہ میں جمعیۃ الطالبات کی ذمہ داران کا انتخاب بھی عمل میں آگیا ہے، جس کی تفصیلات کچھ اس طرح ہیں:

سکریٹری	اسماء بتول	منجو بھا، اعظم گڑھ
نائب سکریٹری	عائشہ شاہد	بسہم، اعظم گڑھ
معتمد خطابت	روش حرا	منجو بھا، اعظم گڑھ
معاون معتمد خطابت	رقیہ احتشام	گورکھپور
معتمد تحریر	ارم لیاقت	منڈیار، اعظم گڑھ
معاون معتمد تحریر	صالحہ مریم	الہ آباد
معتمد لائبریری	نازیہ نصرالدین	بشن پورا، کشی نگر
معاون معتمد لائبریری	صفیہ اسرائیل	الہ آباد
معتمد رسائل وجرائد	زیبا اجمل	ککرہٹہ، اعظم گڑھ

معاون معتمد رسائل و جرائد	سلوبہ ارشاد	الہ آباد
معتمد کھیل کود وورزش	مروہ اسرار	بندی گھاٹ، مئو
معاون معتمد کھیل کود وورزش	آشنا غلام	پھولپور، اعظم گڑھ
معتمد صفائی و باغبانی	آمنہ رضا	دربھنگہ، بہار
معاون معتمد صفائی و باغبانی	شفا مریم	بلریا گنج، اعظم گڑھ

اللہ تعالی تمام ہی ذمہ داران کو اپنی ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دینے کی توفیق عنایت فرمائے، آمین۔

عیدالاضحیٰ کی مناسبت سے جمعیۃ الطلبہ کا مسابقہ

۲۴/اگست ۲۰۱۷ء پنجشنبہ بعد نماز مغرب جامعہ میں عیدالاضحیٰ کی مناسبت سے ایک مسابقہ کا انعقاد ہوا۔ یہ مسابقہ تین گروپ میں منعقد ہوا۔ پہلا گروپ عربی چہارم سے فضیلت کے طلبہ پر جبکہ دوسرا گروپ عربی اول تا عربی سوم اور تیسرا گروپ حفظ وثانوی کے طلبہ پر مشتمل تھا۔

پہلے گروپ کے مسابقہ میں درج ذیل طلبہ نے پوزیشن حاصل کیں:

محمد اسماعیل	عربی چہارم	اول
محمد ذیشان	عربی چہارم	دوم
محمد ریاض	فضیلت سال دوم	سوم

دوسرے گروپ کے مسابقہ میں درج ذیل طلبہ نے پوزیشن حاصل کیں:

یاسر فہد	عربی سوم	اول
سفیان الدین	عربی سوم	دوم
معاذ عیسیٰ	عربی دوم	دوم
مجتبی اللہ	عربی اول	سوم
مجیب الرحمٰن	عربی سوم	سوم

تیسرے گروپ میں درج ذیل طلبہ نے پوزیشن حاصل کیں:

محمد ریان عارف	حفظ	اول
شیخ سعود	ثانوی	دوم

محمد حسان عارف　　　حفظ　　　سوم

پوزیشن ہولڈرس طلبہ کو ۲۶؍اگست ۲۰۱۷ء بروز شنبہ ابواللیث ہال میں انعامات سے نوازا گیا۔

مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی صاحب کی تذکیر

۲۴؍اگست ۲۰۱۷ء بروز پنجشنبہ ابواللیث ہال میں ایک تذکیر جناب مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی صاحب کی ہوئی۔ آپ نے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ لوگ اپنے اوقات کو منظم کریں، قیمتی اوقات کو یونہی ضائع نہ ہونے دیں، کلاس میں مطالعہ کرکے آئیں، اور اس آیت کو ہمیشہ سامنے رکھیں ''ان الذین یتلون کتاب اللہ واقاموا الصلوۃ وانفقوا مما رزقناھم سرا وعلانیۃ یرجون تجارۃ لن تبور''، اپنے علم میں اضافہ کرتے رہیے اور اس کے لیے اللہ تعالی سے بھی دعا کیجیے۔ اسی طرح مولانا نے طلبہ کو ترغیب دلائی کہ وہ علامہ اقبال کے کلام کی روشنی میں ''اقبال کا اسماعیل'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھنے کی کوشش کریں۔

نائب ناظم جامعہ کی تذکیر

۲۹؍اگست ۲۰۱۷ء بروز سہ شنبہ بعد نماز مغرب جامعہ کی مسجد میں نائب ناظم جامعہ جناب مولانا مقبول احمد فلاحی صاحب نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ لوگ نماز کی پابندی کریں، فضول کاموں میں اپنے اوقات کو ضائع نہ کریں، صاف ستھری زبان کا استعمال کریں، بول چال میں استعمال ہونے والے الفاظ درست کریں، اپنے اخلاق وکردار کو سنواریں تاکہ آپ جہاں کہیں بھی جائیں لوگ آپ کو پہچان لیں کہ آپ فلاحی ہیں، اپنے آپ کو نمونہ بنا کر پیش کریں، اپنے والدین کی تمناؤں کو آپ پورا کریں تاکہ وہ آپ سے خوش ہوں۔

جامعہ میں عیدالاضحیٰ کی تعطیل

جامعہ کے تعلیمی کلینڈر کے مطابق عیدالاضحیٰ کی تعطیل ۳۱؍اگست ۲۰۱۷ء بروز پنجشنبہ ہوئی۔ یہ تعطیل ۷؍ستمبر ۲۰۱۷ء تک جاری رہی۔ قرب وجوار کے طلبہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔ ۹؍ستمبر ۲۰۱۷ء بروز شنبہ تمام طلبہ کی حاضری لازمی تھی۔ تاخیر سے آنے والے طلبہ کے لیے پہلے دن دوسو روپے اور پھر یومیہ پچاس روپے غرامہ کا اعلان کیا گیا، تاکہ طلبہ وقت پر جامعہ پہنچ جائیں۔

انجمن طلبہ قدیم کویت یونٹ کی نشست

بتاریخ ۲ ستمبر ۲۰۱۷ء انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کویت یونٹ کی سہ ماہی نشست جناب محمد خالد اعظمی صاحب کی سرپرستی میں منعقد ہوئی، جس کی روداد حسب ذیل ہے:

۱- عزیزم وقار ارشد فلاحی کی تلاوت قرآن کے بعد صدر یونٹ جناب منظور عالم فلاحی نے اپنی تذکیر میں جامعۃ الفلاح کے اغراض ومقاصد کے ساتھ ساتھ اس یونٹ کے مجوزہ اہداف پر روشنی ڈالی۔

۲- بعد ازاں جناب محمد عمر فلاحی صاحب نے مالیاتی رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ یونٹ نے ایک ٹیچر کی تنخواہ، جو کہ گزشتہ تقریباً ۵ سالوں سے جاری ہے، فروری ۲۰۱۸ء تک کی مادر علمی جامعۃ الفلاح کو پیشگی ادا کر دی ہے۔

۳- ساتھ ہی اس بات کا فیصلہ لیا گیا کہ یونٹ کا ہر فرد اپنے ماہانہ تعاون میں انجمن ہاسٹل کے لیے ایک رقم مختص کرے گا اور یونٹ بیچ بیچ میں، ایسے اہل خیر حضرات جو جامعۃ الفلاح کے کاز اور مشن سے واقف ہیں، ہنگامی فنڈ اکٹھا کرنے کی کوشش کرے گی۔

۴- میٹنگ میں حاضر ممبران نے جناب خالد اعظمی صاحب کی سرپرستی و رہنمائی میں میقات نو کے لیے مندرجہ ذیل افراد کا انتخاب بالاتفاق کیا۔

۱- صدر یونٹ:	جناب منظور عالم فلاحی صاحب
۲- جنرل سکریٹری:	محمد سموئیل فلاحی صاحب
۳- خازن:	محمد عمر فلاحی صاحب
۴- انجمن ہاسٹل پروجیکٹ کوآرڈی نیٹر:	خورشید احمد فلاحی صاحب

شرکائے میٹنگ نے عزیزم خورشید احمد فلاحی کو انجمن ہاسٹل پروجیکٹ کے لیے بطور کوآرڈی نیٹر منتخب کیا جو ہر سہ ماہی میٹنگ میں اس پروجیکٹ پر ہوئی پروگریس رپورٹ پیش کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ انڈیا میں مرکزی صدر انجمن اور جملہ متعلقین کو اس سے باخبر رکھیں گے۔ اللہ تعالی سب کو اپنی اپنی ذمہ داریاں بحسن وخوبی ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر قدم پر حامی وناصر ہو۔ آمین

ندیم احمد فلاحی ہمارے درمیان نہیں رہے

برادر ندیم احمد فلاحی (چاند پٹی) ۱۱ر ستمبر کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ چند روز پہلے انھیں شدید اٹیک آیا تھا جس کے چلتے وہ کوما میں چلے گئے تھے مگر قدرت کی مرضی، زندگی موت سے جنگ ہار گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ندیم سیدھے سادھے اور شریف شخص تھے۔ پسماندگان میں تین بچیاں اور اہلیہ ہیں۔ اللہ مرحوم کو غریق رحمت کرے، ان کی لغزشوں کو اپنے عفو وکرم سے ڈھانپ دے، جنت الفردوس نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین ثم آمین!

برادر جاوید بیگ فلاحی اور برادر عابد بیگ فلاحی کو صدمہ

۱۴ر ستمبر کو حیدرآباد سے ایک افسوسناک خبر ملی کہ برادران محترم مرزا جاوید بیگ فلاحی اور مرزا عابد بیگ فلاحی کی والدہ محترمہ اللہ کو پیاری ہوگئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون، اللہ رب العزت مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلی مقام نصیب فرمائے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین ثم آمین

ایک اہم اعلان

قارئین کے لیے ایک بڑی خوش خبری

''ماہنامہ جریدہ حیات نو'' کا آئندہ خصوصی شمارہ جلد ہی منظر عام پر

''محسن انسانیت نمبر''

یہ خصوصی شمارہ ماہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۷ء کے شماروں پر مشتمل ہوگا

اپنی تحریروں، اپنے اشتہارات اور اپنے آرڈرس کے ذریعہ اس خصوصی شمارے کی اشاعت میں تعاون فرمائیں۔

رابطہ کریں:

Mobile:09811126467-09891051676